کہتے کہتے عرصۂ محشر تک آیا ہوں مگر
نامکمل، ہے غمِ ہستی کا افسانا ہنوز

نگارستانِ مآنی

مجموعۂ منظومات سید کلب احمد مآنی جائسی

کی دوسری جلد

پبلشرز

منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ

دھلی - الہ آباد - انبالہ شہر

پہلی بار ۱۹۵۳ قیمت چار روپیہ

شگفتگی نے جو چھوڑی وہ یادگار ہوں میں
خزاں نہ کہہ کہ غبارِ رہِ بہار ہوں میں
مانی۔ جائسی

تہدیہ

اُس پاک طینت اور نیک سیرت فرزند معنوی
کے نام جو اپنے محاسن ظاہر و باطن کے اعتبار سے میری
مسرت اور استعدادِ علم و عمل کے لحاظ سے میرا مایۂ عزت ہے
صاحبزادہ سید محمد امیر امام صاحب زیدی زاد اللہ عمرہٗ و فضلہٗ

آسی۔ جائسی

شبیہ صاحب زادہ سید محمد امیر امام صاحب زیدی سلمہ اللہ تعالیٰ

دیباچہ

نگارستان آنی

تمہید جون ۱۹۳۲ء تک کے اجمالی حالات زندگی اور خلاصہ روداد ضروری نقوش آنی[1] کے دیباچے میں درج ہے لیکن عالم متغیر ہے کل کچھ تو آج کچھ، بقول یگانہ چنگیزی۔

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

اس طور پر میرا ماضی بھی حال سے بدلتا رہا، حالانکہ حال بھی ہر لحظہ ماضی ہی ہوتا رہتا ہے۔

تو اس مذکورہ دیباچے کی سطور آخر سے معلوم ہوگا کہ میں اُس وقت آگرہ میونسپل بورڈ میں ریونیو سپرنٹنڈنٹ تھا اور رسالہ تسنیم (ماہانہ) میری ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

---

[1] راقم کے منظومات کی جلد اوّل جو پہلی بار جون ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئی تھی۔ اور دوبارہ اس زمانے میں شائع ہو رہی ہے۔

صاحب زادہ سیّد امیر امام صاحب زیدی کی اتالیقی

جون ۱۹۳۳ء میں رسالہ تسنیم بعض ناگوار حالات کے ماتحت بند کرنا پڑا اور اسی زمانے میں ایک روز چیرمین صاحب میونسپل بورڈ سے فرائض منصبی کے سلسلے میں گفتگو اس نوبت پر پہنچی کہ ممدوح نے فرمایا۔

"مانی صاحب! کسی کا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ اس کے اہم فرائض کا بار کوئی دوسرا اٹھا ہی نہیں سکتا"

میں جو گفتگو کر چکا تھا اس کے پس پشت یہ خیال ہرگز نہ تھا جو چیرمین صاحب نے سمجھا، شاید اسی لئے ان کا یہ کہنا مجھے بشدت ناگوار ہوا، دن بھر اک پیچ و تاب سا رہا، شام کو پانچ بجے کے قریب جب میں دفتر سے مکان آیا تو عالی جناب راجہ صاحب محمود آباد کی طرف سے بھیجا ہوا ایک تار بایں استفسار ملا کہ آیا میں ان کے ہمشیر زادہ[1] کی

---

[1] یعنی صاحب زادہ سید امیر امام صاحب زیدی جو جناب سید رضا امام صاحب بیرسٹرایٹ لا مغفور کے فرزند دلبند اور عالی جناب سر سید علی امام صاحب مرحوم (باکی پور پٹنہ) کے پوتے ہیں۔ ان کی اتالیقی کی خدمت جب میرے سپرد ہوئی اس وقت ان کی عمر تقریباً سات سال کی تھی لیکن۔ (بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اتالیقی منظور کروں گا۔

میں اسے قدرت کی طرف سے اپنی دن بھر کی کوفت کی جزا سمجھا اور تار ہی کے ذریعے سے اثبات میں جواب دے دیا۔ تین مہینے کی رخصت لی، پھر تین مہینوں کی توسیع، کل چھ مہینے خدمت اتالیقی بجا لانے کے بعد میں میونسپل بورڈ آگرہ کو خیرباد کہنے کے خیال سے آگرہ آیا۔ اور متعلقین کو بھی وہاں سے منتقل کرنا تھا۔

یہاں جو میں آیا تو چیرمین صاحب اور میونسپل بورڈ کے تمام ذمہ دار حضرات مصر ہوئے کہ میں اپنی جگہ پر واپس آجاؤں۔ ترقی مشاہرہ کے بھی وعدے کئے گئے اور ان کا کچھ دنوں بعد ایفا بھی ہوا۔

لیکن میں عجب کش مکش میں تھا اور میرے احباب مخلصین بھی مشورے میں مذبذب تھے۔ آخر قدرت کے فیصلے کے مطابق

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰) بالائے سرش زہوش مندی ہمی تافت ستارۂ بلندی

یہ ستارۂ بلندی اب ماہ کامل کا نور رکھتا ہے یعنی صاحبزادۂ ممدوح ماشاء اللہ تمام محاسن اخلاق اور فضائل انسانیت سے آراستہ اور علوم مشرقیہ و مغربیہ کے تقریباً فاضل ہیں۔ اس وقت کیمبرج یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں (سلمہ اللہ تعالے وزاد اللہ عمرہٗ و اقبالہٗ)

آگرہ کے قیام کو ترجیح دینے پر مجبور ہؤا اور بادل ناخواستہ جناب راجہ صاحب محمود آباد دام اقبالہ کو تار بھیج دیا کہ "اب میں واپس حاضر ہونے سے قاصر ہوں" ایک مفصل عریضہ بھی لکھ دیا غرض پھر ہماں آش در کاسہ۔

ریاست بلہرا کی مدار المہامی

آگرہ سے وقتاً فوقتاً لکھنؤ جانا ہوتا رہا اور عالی جناب راجہ صاحب ممدوح سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا کیا ہیں کہ جون ۱۹۳۵ء میں ایک مشاعرہ برادر عزیز فخر قوم خان بہادر سید کلب عباس صاحب سلمہٗ اللہ نے[1] بریلی میں منعقد کیا، میں اور فانی صاحب مرحوم بھی آگرہ سے آئے اور دوپہر کے قریب بریلی پہنچے۔ میرے بریلی آنے اور رہنے کی تاریخوں کی اطلاع جناب راجہ صاحب کو پہلے سے تھی۔ اور انہیں تاریخوں کو ملحوظ رکھ کر جو تار ان کی طرف سے بھیجا گیا تھا وہ مجھے ٹھیک اسی وقت ملا جس وقت میں برادر عزیز موصوف کی کوٹھی پر پہنچا، یعنی سواری سے اترتے ہی۔

---

[1] ۔راقم کے برادر حقیقی جو اس وقت وکیل سرکار تھے۔

مضمون یہ تھا کہ "ایک روز کے لئے محمود آباد چلے آؤ۔"

میں مشاعرے سے فرصت کر کے محمود آباد گیا۔ جناب راجہ صاحب اور میں تیسرا کوئی نہ تھا جب حضرت ممدوح نے مجھ سے جناب[۵] رانی صاحبہ بلہرا کی ریاست کی بدنظمیوں اور ان حالات کا ذکر فرمایا جن کی وجہ سے ریاست کورٹ آف وارڈس کے زیر انتظام جانے والی تھی۔ اس کے بعد مجھ سے سوال کیا "کیا ان حالات میں تم اس ریاست کی مدار المہامی منظور کرو گے"۔ ابکی بھی میں نے اثبات میں جواب دیا۔

میں آگرہ واپس گیا، اکتوبر میں تار کے ذریعے سے پھر طلبی ہوئی اور ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء سے ریاست بلہرا کا مدار المہام ہوا۔ آگرہ کی نوکری چھوڑ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ٥

تیرہ سال کی مدت اور شاعری

حالات پر خدا کے فضل سے دو ہی تین مہینوں میں قابو حاصل ہو گیا اور تمام امور سطح ہموار پر آ گئے۔

---

[۵] ۔ عالی جناب راجہ صاحب محمود آباد بالقابہ کی زوجۂ محترمہ

ریاست کی اہم خدمات جن میں تقریباً چوبیس گھنٹے دماغ منصرف رہتا تھا، اتنی فرصت کہاں دیتیں کہ میں باطمینان فکر سخن کرتا، پھر بھی کبھی کبھی کچھ نہ کچھ کہہ لیا کرتا تھا، اُس زمانہ میں میری فکر کے محل ایسے سفر گاہ ہوتے تھے جو دیر تک موٹر کار پر تنہا بیٹھے بیٹھے بے شغلی میں طے کئے جاتے تھے۔

تقریباً تیرہ برس اسی طرح گزرے، آخر بعض اختلافات کے باعث میں جولائی ۱۹۴۸ء میں مستعفی ہو گیا۔ اور جب سے مستقل قیام لکھنؤ میں ہے۔

لکھنؤ میں شعر و سخن کی صحبتیں

جس طرح بلہرے میں فرائض ملازمت کی مصروفیت شاعری کا موقع نہ دیتی تھی یونہی لکھنؤ میں افکار و مکارہ کی کثرت بڑی حد تک مانع رہتی ہے۔

پھر بھی لکھنؤ لکھنؤ ہے اور اس کثرت سے یہاں شعر و سخن کا چرچا ہے کہ دوسری جگہ کی فرصت اور یہاں کی عدیم الفرصتی شاعر کے لئے برابر کے میدان ہیں۔

اوّل اوّل ہر روز شعر خوانی کی صحبتوں کی دعوتیں اہل ذوق کی طرف سے آیا کیں بعض دن دو دو تین تین۔ لیکن مجھے پچانوے فی صدی شرکت سے قاصر دیکھ کر اب یہ دعوتیں صرف بہت ہی مخصوص صحبتوں اور بڑے بڑے مشاعروں تک محدود ہوگئی ہیں میں ان میں سے بھی بعض میں شریک نہیں ہوسکتا۔

حکیم صاحب عالم صاحب کے یہاں کی صحبتیں

مخصوص صحبتوں میں محب محترم صاحب عالم حکیم[1] سید محمد قاسم صاحب کے یہاں کی نشستیں بڑی ہی ستھری اور نہایت ہی پر لطف ہوتی ہیں۔

---

[1] یہ ذات محتاج تعارف نہیں ہے مشہور عالم دواخانہ معدن الادویہ کے مالک اور طبیب حاذق ہیں۔ ایک پرانی مثل ہے "نیم شاعر نیم طبیب ہم ہستم" اسے حکیم صاحب نے اُلٹ دیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ "تنہا طبیب نیم شاعر ہم ہستم" حکیم صاحب کی شاعری کا ارباب فہم کی رائے اور اہل سخن کی نظر میں اتنی جلدی ایسی ممتاز جگہ پیدا کر لینا بظاہر حیرت خیز واقعہ ہے۔ یعنی کوئی سات ہی سال انہیں اس میدان میں آئے ہوئے گزرے ہیں اور اب ماشاء اللہ مرد میدان ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر اپنے جوہر انسانیت اور اوج فکر کے اعتبار سے

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

لکھنؤ کے اچھے کہنے والوں کو حکیم صاحب ہر دو چار ہفتوں
کے بعد مدعو فرماتے رہتے ہیں اور انہی دعوتوں میں تغذیۂ روح
بھی ہوتا ہے۔ سامعین سب اہلِ فہم اور اہلِ علم ہوتے ہیں،
بعض صحبتوں میں تو جلیل القدر علماء بھی تشریف فرما ہوتے ہیں[1]
اور ان میں سے بعض کی رونق افروزی اور صحیح داد، شاعر کے
لئے سبق آموز بھی ہوتی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔

یہ بزمِ سخن حکیم صاحب کے یہاں ایسے موقع پر ضرور ہوتی ہے
جب کوئی بلند پایہ شاعر یا ادیب وارد لکھنؤ ہوتا ہے خصوصاً جب
ہمارے قدیم اور عزیز دوست حضرت جوشؔ ملیح آبادی لکھنؤ کی
پکار پر لبیک کہتے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔

جس سطح کا شاعر (شہرت کے بعد) قرار دیا جاتا ہے، اسی سطح پر روزِ اول بھی اس
کی فکر کام کرتی ہے۔ اسی نظریہ کی تصدیق صاحبِ عالم کی روداد شاعری سے بھی
ہوتی ہے۔ تو ان کی شاعری کی کم عمری اور اس کم عمری میں یہ کمال میرے لئے
زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ مواہبِ فطرت ہیں جب آدمی ان سے کام لے گا جوہر
کھل جائیں گے۔ ایک بات ضرور ہے کہ اُن کی فضیلتِ علمی نے شاعری میں اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔

[1] مثلاً نصیر الملۃ مولانا سید محمد نصیر صاحب قبلہ، سعید الملۃ مولانا محمد سعید صاحب قبلہ،
آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ، مولانا سید ابرار حسین صاحب قبلہ پاردی
مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ نونہروی۔

غرض میرے اشعار کی جولاں گاہ بیشتر یہی صحبتیں ہوتی ہیں جن میں بے طلب شریک ہونے کو بھی میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔

سچ پوچھئے تو صاحب عالم نہ صرف بلند پایہ شاعر اور بے مثل طبیب ہیں بلکہ اپنے اعلیٰ اخلاق، ایثارِ نفس، خدا ترسی استواریِ اخلاص، حسن معاشرت، غرض جملہ خصوصیاتِ انسانیت کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہیں۔ اور اپنے اوصاف کی جہت سے ہر طبقے میں نہایت احترام و محبت سے ان کی پزیرائی ہوتی ہے۔

میں اجتماعات ادبی کے علاوہ بھی اپنی فرصت کے اوقات میں صاحب عالم ہی سے مل کر غم غلط کرتا ہوں بلکہ تسکین پاتا ہوں۔ ورنہ حال یہ ہے کہ ہر کوشش کے بعد اپنا یہ شعر مجھے یاد آجاتا ہے۔

قدر و قضا کی طاقت ہوئی دہر میں مسلم
یہ ادا ہوئی ہے خدمت مری سعی رائگاں سے

بہر حال خدائے قادر و حکیم کی مصلحتیں ہماری ناقص عقل و فہم کے احاطے میں مقید نہیں ہو سکتیں اس لئے مجھے یوں بھی تسلی حاصل ہو جاتی ہے کہ

(ماؔنی) سمجھ میں آئے نہ آئے ادائے چارہ گری
مجھے تو ہے یہ بھروسا کہ چارہ ساز ہے تو

معذرت | سعیِ رائگاں کی بہتات سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت بھی کہیں اُسی کے تحت میں نہ آجائے، لیکن جن حضرات کو میں حقیقتاً غیر جانب دار اور سخن شناس سمجھتا ہوں، اُن کے تقاضوں اور حوصلہ افزا اصرار سے میں نے یہ جرأت کی ہے۔ اگر اہلِ نظر سعیِ رائگاں سمجھیں تو حضرات موصوفین کی بات پر اعتبار کرلینے کو میری سادہ لوحی قرار دیں اور مجھے معاف فرمائیں۔ اتنا البتہ عرض کردوں کہ

(ماؔنی) تم اسے سمجھو نہ سمجھو لیکن اے اہلِ خرد
بات دیوانے بھی کہہ جاتے ہیں اکثر کام کی

خاتمہ | اب دیباچہ ختم کرتا ہوں، صرف ایک بات اور کہنی ہے کہ اس مجموعے میں کچھ قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ نقوشِ ماؔنی (حصّہ اوّل) میں بھی ایک قطعہ تاریخ ہے، بس ایک۔ خیر، جیسے ایک ویسی ہی چار یا دس، لیکن فرق یہ ہے کہ

وہ ایک اُردو میں ہے اور اس حصّے میں کچھ قطعات فارسی بھی ہیں۔ اُردو فارسی سب قطعوں کی تعداد[1] چودہ ہے، اور انھیں دوسرے منظومات کی تاریخ تصنیف کے ساتھ مرتب نہ رکھ کر آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔

ان قطعات کے اندراج کا اقدام اگر کسی صاحبِ ذوق کو پسند نہ آئے تو مجھے عفو اور ان کو نظر انداز فرمادیں۔ والسلام

لکھنؤ۔ ۲؍اپریل سنہ ۱۹۵۱ء
مطابق ۲۳؍جمادی الثانی سنہ ۱۳۷۰ھ

عبد مذنب
سید کلب احمد۔ مانی۔ جائسی

---

[1] کچھ قصیدے بھی اگرچہ مل سکے وہ درج کتاب کئے گئے۔

اصلی دیباچہ میں نے ۲ ر اپریل ۱۹۵۱ء کو لکھا تھا اس کے بعد
جو حالات پیش آئے وہ بالآخر ہز ہائی نیس نواب سر سید رضا علی خاں صاحب بہادر
مالقابہ رام پور۔ یو۔ پی کی ملازمت پر منتہی ہوئے یکم جولائی ۱۹۵۱ء سے
میں یہاں ہوں۔ ۲ ر اپریل سے اب تک کی درمیانی مدت میں جو کچھ تصنیف
کیا اس کا اضافہ اس کتاب زیر طباعت میں کیا جا رہا ہے۔

ایک واقعہ میں اپنی شاعری کے سلسلے میں نقوش آنی کے دیباچے
میں بھی لکھنا بھول گیا اور نگارستان آنی میں بھی۔ اتفاق سے،
اس زمانے میں جب نگارستان کی کاپیاں مطبع سے میرے پاس
تصحیح کے لئے آئیں، وہ واقعہ یاد آگیا، اور چونکہ علامہ شبلی کی زیارت
اور ان سے گفتگو یقیناً میرا افتخار ہے اس لئے درج کئے دیتا ہوں۔

۱۹۰۵ء کے کسی مہینے میں ایک روز میرے ایک عنایت فرما محمود
صاحب جو علی گڑھ سے بی۔ اے کر چکے تھے، فرمانے لگے کہ "علامہ شبلی سے

ملنے چلو گے؟" مَیں نے بڑے شوق سے کہا "ضرور" غرض میں علامۂ ممدوح کی خدمت میں محمود صاحب کے ساتھ حاضر ہوا، اُنھوں نے میرا تعارف علامۂ شبلی سے فرمایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ شاعر ہیں اور آنی تخلص کرتے ہیں۔

میری عمر اس وقت کوئی سترہ سال کی تھی اور میں حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں نویں درجے کا متعلم تھا۔ میں ہیچ میرز، اور مولانا کی مشہور عالم شخصیت، تو میں کچھ مرعوب سا تھا کہ مولانا نے تعارف ختم ہوتے ہی ارشاد کیا "ہندوستان کی قبیح ترین رسم شاعری ہے"

مَیں نے بڑی ہمت کر کے عرض کیا "کیا میں استفادتاً کچھ عرض کر سکتا ہوں" اجازت ہوئی اور مَیں نے عرض کیا "کیا شاعری کوئی رسم ہے" - ارشاد ہُوا "میرا مطلب یہ ہے کہ بدترین شغل ہے" - پھر میں نے استفادے کی اجازت لی اور عرض کیا "کیا ہندوستانیوں کے تمام اشغال میں شاعری بدترین ہے، یعنی اس سے بدتر کوئی نہیں" تو حضرتِ علامہ نے اس طفلِ مکتب کی تسکین یوں فرمائی کہ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے جو بدترین اشغال ہیں اُن میں سے ایک شاعری بھی ہے"

اس کے بعد مجھے مزید استفسار کی جرأت نہ ہوئی اور نہ ضرورت بھی نہ تھی۔

چند لفظ اور خاتمہ۔ نگارستان مانی کی کتابت ہو رہی ہے، طباعت میں کم سے کم چند مہینے تو ضرور لگیں گے، لیکن اب میں کوئی اور تتمہ نہ لکھوں گا نہ اس کے بعد کا کوئی کلام درج کرونگا۔ ورنہ سلسلہ شائد غیر متناہی ہو جائے۔ والسلام۔

رام پور۔ یو۔ پی

۱۵ رمئی ۱۹۵۲ء — عبد مذنب

۱۹۔ شعبان ۱۳۷۱ھ — مانی۔ جائسی

نوٹ: ۱۵ رمئی ۱۹۵۲ء کے بعد آج ۲۲ رجولائی ۱۹۵۵ء کو نگارستان مانی کے کتابت شدہ اوراق بعد تصحیح واپس کر رہا ہوں۔ وعدہ تو میرا یہ تھا کہ اب نہ دیباچے کے سلسلے میں کچھ لکھوں گا نہ ۱۵ رمئی ۱۹۵۲ء کے بعد کا کلام اس مجموعے میں بڑھاؤں گا۔ مگر صرف ایک شعر سنئے اور چند الفاظ اور بس۔

سب کمیں مری تقدیر کے ایں ڈالی سے برق کو لاگ نہ تھی
وہ تو ہو کمین جس پہ مرا اس شاخ پہ بجلی گرتی ہے (مانی)

رام پور سے بھی ۱۷ رجون ۱۹۵۲ء کو قطع تعلق ہو گیا۔ مانی جائسی

جائس۔ ضلع رائے بریلی ۲۲ رجولائی ۱۹۵۵ء

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

غزلوں کی فہرست

نظموں کی فہرست

مخمسوں کی فہرست

قطعات تاریخ

بسمہ سبحانہ

۱۔ غزل

جون ۱۹۳۲ء

خوئے غم دل کو ہے، یعنی حسِ غم کچھ بھی نہیں
کیا ہے اب کارگہِ نازو ستم کچھ بھی نہیں

روزِ فریاد سے مغلوب نہیں طاقتِ شکر
جبرِ تقدیر و گراں باریِ غم کچھ بھی نہیں

زندگی مژدۂ غم، موت نویدِ غم تو
کوئی روداد بجز شانِ کرم کچھ بھی نہیں

اک طرف حشر ہیں تو، ایک طرف بحرِ کرم
دامنِ تر تو اب اے دیدۂ نم کچھ بھی نہیں

درخورِ بے خودیِ دل نہ الم ہے نہ سرور
زہرِ غم کچھ بھی نہیں، ساغرِ جم کچھ بھی نہیں

فرقِ ظرفِ دل و پیمانۂ تقدیر نہ پوچھ

اِس نے بھرپور دیا اور اُسے غم کچھ بھی نہیں

کیا خبر کیا ہے یہ ہنگامۂ ہستی فانیؔ
ہم کو اتنا تو ہے معلوم کہ ہم کچھ بھی نہیں

غزل - ۲

جولائی ۱۹۳۲ء

جہاں پہنچا گدا تھا اور محروم تماشا بھی
تمھارے در پہ استغنا بھی حاصل ہے نظارا بھی

ستم حرفِ غلط ہے، لفظِ بے معنی ہے شکوا بھی
کہیں ہوتا ہے نازِ بے پناہِ حُسن بے جا بھی

دیا دل اور دل کے ساتھ عشقِ شور افزا بھی
نہ ہے شانِ کرم، ہر درد کا ہے اک مدادا بھی

قسم ہے زلف و رخ کی کم نہیں ہے صبح روشن سے
تمھاری یاد میں غربت کی شامِ ظلمت افزا بھی

سکوں کے باب میں اہلِ بصیرت کا یہ فتویٰ ہے
سکوں اک لفظ ہے، جیسا کہ ہے اک لفظ عنقا

مجھے ذوقِ سجود اُس در پہ لایا ورنہ حاصل تھا
تصور میں تحیر بھی، تمنا میں تماشا بھی
نہ جینا ہے نہ اب مرنا سفر طے ہو چکا آنی
نفس جادہ بھی تھا منزل بھی گامِ جادہ پیما بھی

۳۔ غزل
اگست ۱۹۳۲ء

تصورِ غمِ ماضی سے بے قرار ہوں میں
کہ عیشِ عہدِ مسرت کا سوگوار ہوں میں
شگفتگی نے جو چھوڑی وہ یادگار ہوں میں
خزاں نہ کہہ کہ غبارِ رہِ بہار ہوں میں
ترے سلوک نے بخشا سکونِ یاس مگر
بہت عزیز ہے امید بے قرار ہوں میں
نہ اور ہوش کہ عہدِ وفا سے دی تسکیں
میں اور جنوں کہ تسلی سے بے قرار ہوں میں
بند آنکھ قیامت میں بھی کھلے نہ کھلے

بہت گناہِ محبت سے شرمسار ہوں میں

نہیں ہے درخورِ وحشت فضائے کون و مکاں
جنوں طراز بہ اندازۂ بہار ہوں میں

جگہ نہ دے مجھے بزمِ طرب میں اے تابی
خزاں کا دَور ہوں برہم زنِ بہار ہوں میں

۴-غزل

ستمبر ۱۹۳۲ء

زیست کے آثار رخصت ہیں محبت دل میں ہے
کارواں جاتا ہے امیرِ کارواں منزل میں ہے

آہ، دم سینے میں باقی ہے نہ حسرت دل میں ہے
اب تو جو کچھ ہے وہ چشمِ منتظر کے تل میں ہے

ہاں ازل سے جو مقدر ہے وہی ہوگا مگر
جذبۂ تائیدِ قدرت سعیِ لاحاصل میں ہے

جاں ستاں ہے حسن کیا حسنِ طلب کی احتیاج

وہ تو زینت کے لئے خنجر کفِ قاتل میں ہے
جس کی منزل ہے بقا وہ جادہ پیمائے فنا
دل ادھر ناقص میں شامل ہے، اُدھر کامل میں ہے
تابِ خلوت کون لا سکتا ہے، دل تو مٹ چکا
کس قدر قاتل ترا جلوہ بھری محفل میں ہے
جسے چاہے حقیقت کہہ جسے چاہے مجاز
ایک صورت جو نظر میں ہے، وہی تو دل میں ہے
تجا ناز آفرینی کے لئے ہے ورنہ حُسن
آرزو خود اس کی شاہد ہے کہ جلوہ دل میں ہے
یہ متاعِ زیست بھی ہوتی ہے فانی نذرِ موت
اک نظر آنکھوں میں ہے اور ایک حسرت دل میں ہے

۵- یاد ہے

نومبر ۱۹۳۲ء

ٹ چکی ہے فصل گل، لیکن زمانا یاد ہے

خون رونے کے لئے اب تک فسانا یاد ہے
یاد ہے چھائی ہوئی گلشن پہ رنگینی تری
اور رنگینی میں اپنا آشیانا یاد ہے
یاد ہے کیفِ ترنم تیرے سازِ حسن کا
وجد میں ڈوبا ہوا دل کا ترانا یاد ہے
پھونک دینا روح کا غنچوں میں وا فرما کے لب
عقدۂ دل کھول دینا مسکرانا یاد ہے
پرسشِ دردِ محبت نت نئے انداز سے
چھیڑنا ہنسنا، ہنسا دینا، رولانا یاد ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں شرحِ راز سب کے سامنے
یاد ہے خلوت کو بھی جلوت بنانا یاد ہے
یاد ہے سب مجھ کو، لیکن تجھ کو بھی اے بے وفا
کچھ وہ آغازِ تمنا کا زمانا یاد ہے؟
یاد بھی ہے کچھ وہ شوقِ گرمیِ بازارِ حسن
سرفروشی کے لئے مجھ کو بلانا یاد ہے؟

میرے سجدوں کی رہا کرتی تھی کتنی آرزو
آستانِ ناز کا لرزش میں آنا یاد ہے؟
کیوں ستم گر مجھ کو دے کر مژدۂ فصلِ بہار
وہ مرے جوشِ جنوں کا آزمانا یاد ہے؟
وعدہ فرما کر مکر جانا ستانے کے لئے
پھر مجھے اندوہ گیں پاکر منانا یاد ہے؟
یاد ہے پیمانِ اُلفت سے وہ دل جوئی مری
میرے دل کی طرح اُس کا ٹوٹ جانا یاد ہے؟
بے مروت کیا قیامت ہے کہ سب کچھ بھول کر
اب فقط اک بھول جانے کا بہانا یاد ہے
خیر یاد آجائے گا کل حشر میں عہدِ وفا
آج اگر عہدِ وفا کا بھول جانا یاد ہے

غزل ۔ ۶

نومبر ۱۹۳۲ء

تعجب ہے اگر دیکھو نہ میرے غم کو نفرت سے

بہت مانوس ہے یہ مجھ گنہہ گارِ محبت سے
ذرا دشواریِ منزل بڑھا دینا عنایت سے

ستم نے کر لیا ہے ساز اب میری طبیعت سے
زباں کیا، دل کو بھی نا آشنا رکھا شکایت سے

خدا کا شکر ہے، واقف ہوں آدابِ محبت سے
کرم ہے آپ کا قصدِ کرم، لیکن مری قسمت

کہ بس چلتا نہیں اب تنگیِ وقتِ عیادت سے
ملا اذنِ جناں، پیدا ہوا اندیشۂ حرماں

نظارہ حشر میں جب ہے تو یہ بہتر ہے جنت سے
نہ اُکتا دُستم دلدوز بھی ہے مجھ میں حسِ بھی ہے

میں کچھ پاسِ وفا سے چپ ہوں کچھ مجبورِ عادت سے
مجازاً سر جھکا رکھا حقیقت میں ترا در تھا

بلندی وام ہے ہر آستاں کی تیری رفعت سے
صلہ دے یا نہ دے لایا ہوں شکر اور شکرِ ناکامی

یہ ہدیہ سب سے بہتر ل سکا ہے دار محنت سے

کڑی منزل میں رہرو تیز تر چلتا ہے اے آنی
کٹے گی جلد راہِ عمر احساسِ مصیبت سے

۷۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۲ء

بر سرِ ناز کیوں نہ پھر ناصیۂ نیاز ہو
سجدہ اُس آستاں کا جب طرۂ امتیاز ہو

چاہیے جو کچھ نتیجۂ خلوتِ سوز و ساز ہو
فرصتِ یک نفس ملے، میں ہوں حریمِ ناز ہو

آپ کے سامنے کسے تابِ نگاہ و گفتگو
نرگسِ نیم وا ہو یا غنچۂ نیم باز ہو

ہے وہی آستانِ ناز ضامنِ رفعتِ جبیں
سجدہ گہہِ بلند پر سر ہو تو سرفراز ہو

حسن تو آشکار ہے پھر بھی حجاب در حجاب
جیسے خدا نخواستہ عشق کی طرح راز ہو

نفع نہیں ہے بے خطر ہمت سعی سے نہ ڈر
راہِ نشیب قطع کر، منزل اگر فراز ہو
ڈر ہے کہ عارضی نہ ہو رونقِ کارگاہِ ناز
حسن ابد نصیب ہو، عمرِ ستم دراز ہو
یا ہو تمام آگہی، یا ہو کمالِ بے خودی
وہ جو نہیں تو یہ سہی، سوز نہیں تو ساز ہو
آنیؔ زار جب یہ ہے ذوقِ طلب تو دیکھئے
شام کہاں جھکائے سر صبح کہاں نماز ہو

۸۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۲ء

عشق ہے غم جو سکھاتا ہے فنا ہو جانا
دردِ دل ہے جسے آتا ہے دوا ہو جانا
درسِ ہمت ہے نئے رہروِ الفت کیلئے
کانٹے پانا تو مرا برہنہ پا ہو جانا

عشق پیارا ہے تو نعمت ہے غمِ مہجوری
اُن کا ملنا ہے محبت کا جدا ہو جانا

ہوشِ لاحاصلِ شکوۂ ناکامی ہے
بے خودی میں مرا راضی برضا ہو جانا

اے پشیمانِ ستم جا کہ جہاں دیکھ چکا
میرا مرنا ترے وعدے کا وفا ہو جانا

وصلِ جاناں کی تمنا ہے تو مٹ جا پہلے
یوں میسر نہیں بندے کو خدا ہو جانا

سانس گنتا ہوں تمنا میں کہ دیکھوں آنی
غمِ دل کا ادب آموزِ فنا ہو جانا

۹۔ غزل

دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء

چمن والے مرے شیون سے عاجز تھے چمن چھوٹا
مبارک خارزارِ وادیِ غربت وطن چھوٹا

کیا ہے لذتِ آزار نے مستغنیِ راحت
وہ وحشی ہوں نہ کانٹوں سے ہٹا پیچھے نہ بن چھوٹا

تسلی اہلِ محفل کی ہے میری بے پرو بالی
جیوں بھی اب تو کیا ہے طوفِ شمعِ انجمن چھوٹا

فضا میں ہو جو آزادی تو ویرانہ بھی جنت ہے
کہ قیدِ رسمِ زنداں سے گرفتارِ محن چھوٹا

غمِ ذلت سے بڑھ کر رنجِ بے تاثیریِ الفت
جب ان صدموں سے دل ٹوٹا تو شوقِ انجمن چھوٹا

بہت غصے میں ہے صیاد لیکن مطمئن ہوں میں
سزا اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی چمن چھوٹا

بٹھائے رکھتی تھی یادِ چمن گلزار میں ہر دم
اجل کیا آ گئی مانی، یہ معمولِ کہن چھوٹا

۱۰۔ غزل

فروری ۱۹۳۳ء

پیامِ یاس دے اے نگاہِ یار مجھے
رکھ اضطراب کی خاطر امیدوار مجھے

نئے کرشمے دکھاتا ہے اعتبار مجھے — خزاں ہے عالمِ نیرنگیٔ بہار مجھے
وفورِ شوق سے آنکھوں میں روح کھنچ آئی — پیامِ موت تھا وعدے کا اعتبار مجھے
نظر اٹھا کہ مری زندگی ہے بیک — میں کھو نہ جاؤں کہیں اک نظر پکار مجھے

جزا ہے غم کی تو مل جائے آج اے آنی
کہ سو غموں کا ہے غمِ کل کا انتظار مجھے

۱۱-غزل

اپریل ۱۹۳۳ء

نقشِ احسانِ تجلی آج بھی باطل نہیں
چھپ گئی بجلی تو کیا خاکسترِ حاصل نہیں

وائے قسمت فرصتِ دیوانگی حاصل نہیں
ہوش یعنی فکرِ درماں سے ابھی غافل نہیں

اک نہ اک صورت میں باقی ہے تمنا کا وجود
گردبادِ خاکِ مجنوں ہے اگر محمل نہیں

آرزوئے راحتِ ساحل ہے لئے ڈوب مر

موج کیا ساحل نہیں گرداب کیا ساحل نہیں
امتحانِ طاقتِ تقدیر فانی کیا ضرور
سعی میں کیا معنی لاحاصلی شامل نہیں

۱۲۔ غزل

اپریل ۱۹۳۳ء

رہِ الفت میں یوں تو کعبہ و بت خانہ آتا ہے
جبیں جھکتی ہے لیکن جب درِ جانانہ آتا ہے
سفر طے ہو چکا شاید درِ جانانہ آتا ہے
کہ دل سوئے جبیں سجدے کو بے تابانہ آتا ہے
تری امیدِ وصلِ حور ہے اک زہد پر مبنی
مگر واعظ مجھے ہر شیوۂ رندانہ آتا ہے
ہنسی آئے تجھے یا نیند لیکن آہ مجھ کو تو
بس اے بیگانۂ درد ایک ہی افسانہ آتا ہے
دل اجڑا جب تو پھر باقی کہاں دنیا میں آبادی

نگاہیں جس طرف اُٹھیں، نظر ویرانہ آتا ہے

ہمیشہ حسبِ استعداد ہے فیضانِ قدرت بھی
بہار آئی چمن میں وحشت میں دیوانہ آتا ہے

ٹھکانا پھر غمِ دنیا نے پایا بعد مدت کے
کہ اپنے ہوش میں پھر مانیِ دیوانہ آتا ہے

۱۳- غزل

اگست ۱۹۳۳ء

اور کیا الفت میں برگ و ساز ہونا چاہیئے
ایک جاں اور اک دلِ جاں باز ہونا چاہیئے

فاش احساناتِ غم کا راز ہونا چاہیئے
خامشی میں درد کی آواز ہونا چاہیئے

در بھی کھلتا ہے قفس کا مثلِ آغوشِ فضا
دل میں لیکن حسرتِ پرواز ہونا چاہیئے

جان دے کر بھی یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی

سجدہ اک شایانِ شانِ ناز ہونا چاہئے
ناز فرماتے رہے اب تک بہ عنوانِ ستم
اب ستم بھی بر سبیلِ ناز ہونا چاہئے
راز میں امکانِ عریانی کا بھی مفہوم ہے
اُن کا جلوہ ماورائے راز ہونا چاہئے
ہر گدا ہم پایۂ سلطان ہے لے آنی مگر
شرط یہ ہے بندگی پر ناز ہونا چاہئے

۱۴ غزل

اگست ۱۹۳۳ء

نہ ساقی ہو نہ میکش ہوں نہ مطرب ہو نہ محفل ہو
جو کچھ بھی ہو کرشمہ سازیِ نیرنگیِ دل ہو
اگر دل ہو تو پامالِ ستم ٹوٹا ہوا دل ہو
تمنائے کرم کا دل کو حق آنا تو حاصل ہو
یہ رونا ہے کہ شاید ہی کرم فرمائے اب بجلی

وگرنہ کون کافر ہے جسے افسوسِ حاصل ہو
اگر کچھ اور ہوتی، تیری دامن گیر کیوں ہوتی
نہ دامن کو جھٹک، ممکن ہے یہ خاکسترِ دل ہو

ہنسے کیونکر نہ اس کی شانِ مختاری پہ ہر ذرّہ
اجازت شرحِ مجبوری کی بھی جس کو نہ حاصل ہو

جنوں کی احتیاطیں سر جھکا دیتی ہیں مجنوں کا
کہ شاید گرد بادِ دشت کے پردے میں محمل ہو

طلب تو میرے قاتل کی تھی شاید بزمِ محشر میں
تم آئے سامنے، کیا تم خدا ناکردہ قاتل ہو

رسائی کس کی ہے میرے تنفس کی فضاؤں تک
وہ نالہ قمریوں کا ہو کہ گل بانگِ عنادل ہو

فنا اور عالمِ ایجاد، کیا کہتا ہے اے آنی
اگر یہ جلوۂ حق ہے تو ناممکن ہے، باطل ہو

۱۵۔ غزل

ستمبر ۱۹۳۳ء

تیرے قدموں کی قسم، یہ ستم ایجادی ہے
دل نوازی تری ظالم مری بربادی ہے

اب تو ہاں میری ہے اور لائق بربادی ہے
یہ بھی کچھ یاد ہے کس نے یہ تمنا دی ہے

بلبل آوارہ ہے اور گل سبدِ گلچیں میں
تیری مجبوری سے بدتر مری آزادی ہے

پرِ پرواز ہیں اور کشمکشِ بیم و امید
اُف تلوّن ترا کیا حشر نما وادی ہے

دیکھئے ہوتا ہے کب تکملۂ ویرانی
تابِ غم دل میں ہے یعنی ابھی آبادی ہے

کششِ دام پہ نازاں نہ ہوا تنا صیاد
سببِ ذوقِ اسیری مری آزادی ہے

بیچ کے اس راہ سے چلئے کہیں مانی ہی نہ ہو
کوئی انصاف گہہِ حشر میں فریادی ہے

۱۶۔ غزل

نومبر ۱۹۳۳ء

کیوں ترکِ لذتِ خلشِ آرزو کریں
آؤ نہ آج تا درِ دل جستجو کریں

مجروح تو نہ ہو کہیں پندارِ دل بری
ہم چاہتے ہیں زخم تمنا رفو کریں

اے برق تیرے جلوے کا کیا پوچھنا مگر
اب آشیاں کہاں کہ تری آرزو کریں

چپ لگ گئی جنون میں یعنی یہ ہوش ہے
دیوانے عقل والوں سے کیا گفتگو کریں

مانی ہے اور عافیتِ کنجِ میکدہ
اہلِ ہوس نمائشِ جام و سبو کریں

۱۷۔ غزل

نومبر ۱۹۲۳ء

روتا ہوں یوں کہ زیست اگر بے فغاں رہے
ان کو ملال ہو کہ ستم رائگاں رہے

جلوہ صلائے سجدہ ہے عالم جواب ہے
ممکن نہیں جبیں نہ رہے آستاں رہے

بنیادِ خلقتِ دل خانہ خراب تھی
یہ گفتگو کہ دردِ محبت کہاں رہے

گرتی نہ برق تو بھی گوارا نہ تھا مجھے
موسم بہار کا نہ رہے آشیاں رہے

مانیؔ وہ بے نقاب ہوئے حشر ہو گیا
سہنے کو یوں زمین رہے آسماں رہے

۱۸۔ غزل

فروری ۱۹۲۴ء

مرادِ دل میں کوئی کامیاب ہو نہ سکا

سراب سعی سے پیاسے کی آب ہو نہ سکا

کمالِ حسنِ ازل ہے حجابِ حسنِ ازل
نقاب اُلٹ کے بھی وہ بے نقاب ہو نہ سکا

صلائے خاصگیِ حسن عام تھا لیکن
وہ نظمِ بزم کہ میں باریاب ہو نہ سکا

مآلِ ہستیِ موہوم تھا مجھے معلوم
کبھی ترددِ تعبیرِ خواب ہو نہ سکا

درازیِ شبِ غم اختصارِ روزِ جزا
ملی نہ داد کہ غم کا حساب ہو نہ سکا

تری رضا تو ہے جنت، جو تیری مرضی ہے
ہوا عذاب تو مجھ پر عذاب ہو نہ سکا

یہ خیریت تھی کہ مٹنا محال تھا دل کا
فلک نے سعی تو کی، کامیاب ہو نہ سکا

ہوئی بنائے دو عالم کہ ظرفِ عشق ہے
بنا، مگر مرے دل کا جواب ہو نہ سکا

مری نظر میں تھی آنی حقیقتِ تسکیں
یہ راز ہے کہ مجھے اضطراب ہو نہ سکا

۱۹۔ شاعر کا مذہب

مارچ ۱۹۳۴ء

نگاہوں میں ہے اب تک منظرِ صبحِ ازل اے دل
یکایک وا درِ میخانہ ہائے راز ہو جانا
وہ جوشِ فیض وہ پیہم صلائے عام ساقی کا
وہ پیاسے میکشوں کا گوش بر آواز ہو جانا
اُدھر شیشے تھے مشروباتِ رنگا رنگ سے مملو
اِدھر انواعِ مخلوقات شامل مے گساروں سے
فرشتے، آدمی، جن، عالمِ ایجاد کی ہر شے
بڑا مجمع تھا، اور شاعر بھی تھا امیدواروں میں
عطائے دستِ قسامِ ازل کی حد بیاں کیا ہو
ملی سب کو بقدرِ ظرف، جس میکش نے جو چاہی

مسرت، ابتلا، حسنِ نمایاں ، خوبیِ باطن
متاعِ دیں، فلاحِ دنیوی، درویشی و شاہی
بھرا ہر فردِ موجودات نے پیمانۂ قسمت
نہ باقی بوند بھر بھی تھی نہ کوئی جام خالی تھا
بچالی تھی مگر ساقی نے دو شیشیوں میں تھوڑی سی
اور امیدِ کرم میں ایک مردِ لا اُبالی تھا
شرابِ دردِ دل تھی جلوہ گر اک آبگینے میں
جھلک تھی دوسرے میں بادۂ خو آشنائی کی
وہ مردِ لا اُبالی شاعرِ محرومِ قسمت تھا
نظر پڑتی تھی اب جس پر خدا کی اور خدائی کی
لیا ممزوج اِن دونوں شرابوں کو جو ساقی نے
ہوئے تازہ مشامِ خلق بوئے روح پرور سے
ہوائیں عطر برسانے لگیں اس طرح شاعر پر
فلک سے فصلِ گل میں جیسے شبنم پھول پر برسے
اٹھا کر شیشہ پھر ساقی نے یہ ارشاد فرمایا

ادھر لا جام اپنا اے کہ تیرا نام مانی ہے
یہ وہ شے ہے کہ پینا جس کا ہے خونِ جگر پینا
مگر یہ یاد رکھ ہر قطرہ دریلئے معانی ہے
مبارک ہو تجھے اے شاعرِ رنگیں نوائے جا
یہی حصہ تری قسمت کا ہے اور تیرا مشرب ہے
یہ تیری زندگی ہے بلکہ تیری زیست کا حاصل
یہ تیرے رہبرِ مقصود یعنی تیرا مذہب ہے
سوئے ساقی چلا پیمانہ لے کر اس طرح مانی
کہ اطمینان صدقے ہو گیا اُس کی اداؤں پر
اُدھر لبریز تھا شاعر کا ساغر ان شرابوں سے
تبسم اس طرف شاعر کا چھایا تھا فضاؤں پر

۲۰- غزل

جون ۱۹۳۴ء

دل میں سوزِ مشتعل، سر میں خرابِ راز ہے

شائد اے مانی، محبت کا یہی انداز ہے
بے نیازِ قصد ہیں تیری کرشمہ سازیاں
یہ تو اک انعامِ فطرت اے نگاہ و ناز ہے
اپنے دل میں ڈھونڈھ اے مرغِ چمن روحِ بہار
رائگاں سعیِ تجسس میں تری پرواز ہے
تیرے دل کی آرزو تھی سب سے پہلی آرزو
تو تو اے جانِ تمنا خود تمنا ساز ہے
منظرِ شام و سحر ہو یا فضائے بحر و بر
پیکرِ فطرت کا ملبوسِ حیات انداز ہے
لطف اٹھائے سیر کی جی بھر کے اے عہدِ شباب
اب تو جینے کی ہوس اک سازِ بے آواز ہے

قطعہ

مرد کو عورت سے کیا نسبت یہ بلبل ہے وہ گل
یہ نیازِ مستقل ہے وہ سراپا ناز ہے
آرزوئے دل ہے شایانِ جمالِ گل، مگر

غم گسارِ دل فغانِ بلبلِ جاں باز ہے
دیر و کعبہ کیا ہے اے آنی جہاں دیکھو وہیں
سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے جلوہ گاہِ ناز ہے

۲۱- دنیا سے بیزار (تضمین بر قطعہ غالب)

اگست ۱۹۳۴ء

نشترِ غم کی خلش، پیکانِ حرماں کی کھٹک
مجھ سا پامالِ جفائے آسماں کوئی نہ ہو
آہ، میں وہ آشیاں برباد ہوں جس کے لئے
شہر و گلشن میں کہیں جائے اماں کوئی نہ ہو
رحم اُس بیکس پہ فرماتے ہیں ابنائے زماں
برگ و سازِ زندگی جس کے یہاں کوئی نہ ہو
لطف یہ مجھ پر بھی ہوتا ہے مگر اس شان سے
جس سے بدتر صورتِ جورِ نہاں کوئی نہ ہو
یا الٰہی ایسا اک گوشہ کہیں ملتا جہاں

راز جو کوئی نہ ہو اور راز داں کوئی نہ ہو

چاہتا ہے دل کہ اب اس تنگ نائے دہر میں

"رہیئے بس ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو"

بارِ منت سے گراں تر تو نہیں بارِ الم

شوقِ گل میں خار سے اُلجھاؤں دامن کس لئے

اقربا دادِ جراحت دیں گے اس امید میں

ہر نفس کے ساتھ کیوں انسان خونِ دل پیئے

کی نہ بھولے سے بھی پروائے رفیق و رہنما

اہل دل نے زندگی کے راستے یوں طے کئے

کنجِ استغنائے تنہائی مجھے بھی ہے پسند

ظلمِ راہ و رسمِ ہمدردی سے بچنے کے لئے

محض ویرانی میں اب ڈھونڈھوں گا میں تسکینِ دل

کون یوں ہنگامہ زارِ دھر میں مضطر جیئے

اس کو وحشت ہی کوئی سمجھے مگر جی میں یہ ہے

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہم سایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو"

س زمیں پر میں ہوں، اور ہو میرے سر پہ آسماں"
یہ فضا شائد ہو روحِ مضطرب کو سازگار

ں بسر ہو جتنی باقی رہ گئی ہے زندگی
کوئی مونس ہو نہ ہمدم ہو نہ کوئی غم گسار

چارہ سازی دور، کوئی پوچھنے والا نہ ہو
یعنی دردِ دل نہ ہو احسانِ درماں سے دوچار

تابشِ داغِ الم جب نور پھیلانے لگے
ظلمتِ شامِ الم بن جائے اس کی پردہ دار

کوئی پہلو میں نہ ہو اور کوئی بالیں پر نہ ہو
کس مپرسی پر ہو مرگ و زندگی کا انحصار

ہو اگر صحت تو کوئی تہنیت فرما نہ ہو
" پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار

اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"

۲۲- تخمیس

(بر غزل غالبؔ مغفور)

ستمبر ۱۹۳۴ء

ظاہر ہے کہ یہ نظم جو خمسہ کی گئی ہے غالبؔ مغفور کے ذاتی تاثرات کا نتیجہ اور ایک خاص فرد کی مفارقتِ دائمی کا مرثیہ ہے۔ کوئی اور عارفِ مرحوم کے لئے وہ جذبات کہاں سے لائے جو اس نظم میں پیوند لگائے۔ صرف ایک محترم کرم فرما کے ارشاد کی تعمیل ہے۔

ماقیؔ۔ جائسی۔

شکوہ جینے کا افسوس نہ دیکھا کوئی دِن اور

جانا تھا تو کیا آج کا دن کیا کوئی دن اور

تجویز کیا کیوں نہ سفر کا کوئی دن اور

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور

تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اچھا جو ترا عتبۂ برتر نہ گھسے گا

کیا سجدۂ پیہم سے مرا سر نہ گھسے گا
کیونکر نہ گھسے، دیکھوں تو کیونکر نہ گھسے گا
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

موت آئے نہ مجھے کاش کہ آرام تو پاؤں
غم درخورِ برداشت اگر ہو تو اٹھاؤں
اس غم کے تحمل کو جگر کون سا لاؤں
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

کم شامِ جدائی بھی نہیں روزِ جزا سے
کیا چاہتے ہو فتنۂ محشر ابھی اٹھے
تا حشر نہ مانے گا دل اس طرح کے دعدے
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

نووارد بازارِ جہاں تھا ابھی عارف

ناواقفِ ہر سود و زیاں تھا ابھی عارف
آگاہِ غم و عیش کہاں تھا ابھی عارف
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ویراں کیا تم نے مرے کاشانے کو مر کے
جلوہ تھا جسے ظلمتِ غم دیکھ کے سر کے
گھر والے تھے محتاج نہ انجم نہ قمر کے
تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

ہے جان امانت کسے انکار ہے اس سے
لیکن ابھی تم خیر سے کے روز جئے تھے
یوں جان کو فوراً ہی نہ کرنا تھا حوالے
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

واں بھول ہی جاتا ہے مخالف کی برائی

بالفرض اگر ہو بھی نہ سکتی ہو صفائی
تو بھی کوئی تج دیتا ہے اس طرح خدائی
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ہاں سچ ہے کہ دنیا میں رہیگا کوئی کیا خوش
اس منزلِ آفات میں کب کوئی جیا خوش
کرتے ہیں بسر پھر بھی تو رنجیدہ ہوں یا خوش
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

کیا اس سے غرض تم کو کہ کیوں جیتے ہو غالب
یہ مسئلہ رہنے دو کہ کیوں جیتے ہو غالب
کیا فائدہ کیوں پوچھو کہ کیوں جیتے ہو غالب
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۲۳- غزل

ستمبر ۱۹۳۴ء

تابِ الطاف نہ لایا دلِ خو کردۂ غم
کرمِ سیل تھا گویا کہ ترا سیلِ کرم

دل ہے بیگانگیِ عشق میں دنیائے الم
صد غمِ لذت و محرومیِ یک لذتِ غم

برقِ خرمن سے بچالے فلک اے خرمنِ برق
اور کچھ دے، غمِ حاصل ہی نہیں حاصلِ غم

فکرِ تاثیرِ دعا وجہِ دعائے تاثیر
المِ چارہ گری، چارہ گریہائے الم

یاد بھی صحبتِ دوشینہ کی ہے ہجر بھی ہے
یہ بلائے غمِ شب ہے کہ سوادِ شبِ غم

عشق میرا طلبِ حسن ہے یا حسنِ طلب
حسن تیرا ستمِ عشق ہے یا عشقِ ستم

ترجمانِ دلِ خوں گشتہ ہے ہر داغِ سرشک
ہے نم دیدۂ مانی بھی مگر دیدۂ نم

۲۴۔ عورت

اکتوبر ۱۹۳۶ء

مقصودِ نگاہِ اہلِ بینش　　سرمایۂ نازِ آفرینش
جنت ہے مراد تیرے دم سے　　دل خوش ہے تو ہے شاد تیرے غم سے
تسکین کو اضطراب کر دے　　جو چاہے تو انقلاب کر دے
پردہ ترا شوق آفریں ہے　　جلوہ ترا ذوق آفریں ہے
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

تحصیلِ دل افتخار تیرا　　پامالیِ جاں شعار تیرا
ہے خیر سے دلبری دلیری　　دل چھین لیا نگاہ پھیری
میں نے جب یہ خطا کہیں کی　　تیری طرف اعتنا نہیں کی
تعزیرِ کشش ہوئی دو بالا　　آنچل سرکا دیا سنبھالا

اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

فرمائشِ سوز، ساز تیرا　ایمائے نیاز، ناز تیرا
بیگانہ وشی ہے آشنائی　ہر سعیِ حجاب خود نمائی
منہ پھیرے ہوئے کشادہ کاکل　دنیا کے وجود سے تجاہل
پھیلا ہوا دل کے واسطے جال　حیلہ کہ سکھائے جاتے ہیں بال

اللہ یہ رنگ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

جب تجھ کو ہوا کبھی یہ شبہا　تھا تیغ نظر کا وار اوچھا
بس بن گئی ایک برقِ مضطر　ایسی کہ شکار ہو نہ جاں بر
گردن موڑی، نظر جھکائی　شانے دیکھے، ملی کلائی
قامت کو عطا کیا وہ عنواں　ہو جس سے خمِ کمر نمایاں

اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

حیراں ہوں یہ ہے نمائشِ حسن　یا ہوتی ہے آزمائشِ حسن

اے نشۂ دلبری سے سرشار بر حق ہے انسانیت کا پندار
کیا ہے جو ہو تجھ سے بڑھ کے پیارا آ۔ دل میں ہو آ کے مسند آرا
زیبد بہ تو شانِ حکمرانی ہے نذر تری یہ نظمِ مانی
اللہ یہ رنگِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

۲۵ غزل

نومبر ۱۹۳۴ء

غم مرا ممد ہے خدا کے لئے میری تسلیم ہے رضا کے لئے
دل ہے ناداں تری ادا مبہم اور تفصیل کچھ خدا کے لئے
کر لیا تھا خیال میں وعدہ خواب میں آ گئے وفا کے لئے
قیدِ امید سے رہا نہ کرو کیا ضمانت ہے پھر وفا کے لئے
آہ مانی ۔ تڑپ رہا ہے دل
ایک بے رحم بے وفا کے لئے

۲۶- روحِ محبت

دسمبر ۱۹۳۷ء

وقارِ عشق بالاتر ہے احساسِ تفاوت سے
یقینِ عشق ہے مستغنیِ اوہامِ بیش و کم
محبت بے نیازِ قیدِ امکان و تعین ہے
یہاں باطل ہے فرقِ کوزۂ خاکی و جامِ جم
دلِ فرہاد کو ملتی ہے دولت عشقِ شیریں کی
زلیخا ہے جمالِ یوسفی سے طالبِ مرہم
"نہ تنہا عشق از دیدار خیزد" یہ بھی ظاہر ہے
"بسا کیں دولت از گفتار خیزد" اندریں عالم
نظر یا سامعے کی بھی کوئی حاجت نہیں اس کو
خیال و خواب میں نشو و نما پاتا ہے دل کا غم
مری پاکیزہ الفت اصل میں روحِ محبت ہے
کہ تھی بیگانۂ جس اور بیگانہ رہا پیہم

مقدر نے دلِ بے تاب کو محروم ہی رکھا
تمنا چل بسی اُمید کا کرتی ہوئی ماتم
کہوں کیا آہ ۔ دل کے سانحے کی حسرت انجامی
"بہ نومیدی حزیں از کوئے او بار سفر بستم
خدا صبرے کند روزی دلِ امیدوارم را"

۲۷۔ غزل

مارچ ۱۹۳۵ء

تجلی چاہتی ہے میرا دنیا سے گزر جانا
یہ دم آنکھوں میں ہے تم نے جسے تاب نظر جانا
یہی ہے عمر بربادِ تمنا کا سنور جانا
جبیں رکھنا تمہارے آستاں پر اور مر جانا
بہت دشوار ہے راہِ محبت سے گزر جانا
جو ممکن ہو تو بارِ مدعا کو چھوڑ کر جانا
نہیں اب کوئی بے ربطی رگِ جاں و رگِ دل میں

دوائے درد تھی ہم نے جسے دردِ جگر جانا

کہاں تک شرحِ غم ہو زندگی کچھ اس طرح گزری
کہ دل کو اک عذابِ روح سمجھا، دردِ سر جانا

نہیں حسرت نہ سمجھو، یہ تو میرا دم نکلتا ہے
اب آئے ہو تو انجامِ تمنا دیکھ کر جانا

اسیری کا اُسے غم ہو جسے کچھ ہوش ہو گھر کا
کھلیں آنکھیں تو زنداں میں کھلیں زنداں کو گھر جانا

فرازِ طور اُنھیں پیارا، نشیمن مجھ کو پیارا تھا
مجھی کو بعدِ موسےٰ برق نے اہلِ نظر جانا

سہارا موت کا کیوں ڈھونڈھتا ہے شانۂ فانی
غمِ دل کو حیاتِ جاوداں سے مختصر جانا

۲۸- غزل

جون ۱۹۳۵ء

ذرے ہیں مہر، فیض سے پرتو روئے یار کے

آج تو جلوے ماند ہیں شمع سرِ مزار کے
حوصلے نکلے دم کے ساتھ طالبِ دیدیار کے
دن بھی پھرے تو یوں پھرے دیدۂ انتظار کے
موت نے جبر سے مرا رختِ وجود اتار کے
خوب اُڑائے مضحکے نخوتِ اختیار کے
غم ہے بہار کا فسوں، غم کی بہار کیا کہوں
آنکھیں ہیں اور سرشکِ خوں دیکھئے دن بہار کے
مجھ کو مٹا چکے مگر اُن کی خلش نہیں مٹی
آنکھوں میں اب کھٹکتے ہیں ذرے مرے غبار کے
کچھ بھی نہیں خزانِ گل، کچھ بھی نہیں بہارِ گل
دل نے یہ نام رکھ لئے اپنے ہی اعتبار کے
مانی بے خبر یہ سب فیضِ شعارِ حسن ہے
مہر و مہ و نجوم کیا، ذرے ہیں رہ گزار کے

۲۹-تخمیس

برغزل حضرت محبوب، سرکار محمد امیر احمد خاں صاحب راجۂ محمود آباد

جنوری ۱۹۳۶ء

سکوتِ خاکِ دل اک سعیِ لاحاصل نہ بن جائے
یہ ضبطِ بے قراری کوششِ باطل نہ بن جائے
نیا آئینۂ بیدادِ اے قاتل نہ بن جائے
تڑپ کر یادگارِ حسرتِ بسمل نہ بن جائے
نظر کر یوں نہ ذرے پر کہیں یہ دل نہ بن جائے

غنیمت ہے کہ رحم آیا تمھیں اربابِ الفت پر
فدا ہو جان مشتاقوں کی اس لطف و عنایت پر
مگر احسان ہی کرنا ہے جب اہلِ محبت پر
کرو کیوں منحصر دیدار فردائے قیامت پر
جو آساں آج ہے وہ کل کہیں مشکل نہ بن جائے

دہ ٹھہرے دل تو ندی آنسوؤں کی ہے کہ بہتی ہے

زرا دم لے تو جانِ زار کربِ موت سہتی ہے
عجب اک کش مکش راہِ غمِ الفت میں رہتی ہے
سفر ہے دور کا اور ناتوانی مجھ سے کہتی ہے
جہاں تو تھک کے بیٹھا ہے، یہی منزل نہ بن جائے

یہ مانا ہم نے تو مجبور بھی ہے بے نوا بھی ہے
غمِ فرقت سے تیرے دل میں دردِ جاں گزا بھی ہے
مگر دنیا میں آخر کوئی شے پاسِ وفا بھی ہے
سنبھل اے قیس جذبِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہے
یہ غمِ لیلےٰ نہ بن جائے، یہ دل محمل نہ بن جائے

ہمیشہ اک نہ اک سازِ خلش دل کو میسر تھا
کبھی خارِ تمنا تھا کبھی حسرت کا نشتر تھا
غمِ بے تابیٔ دل کس لئے اہلِ جہاں پر تھا
سکوں ملتا تو لطفِ زندگی کھوتا، یہی ڈر تھا
کہ موجِ اضطرابِ دل کہیں ساحل نہ بن جائے
یہ اندیشہ تھا ہر ہر سانس میں پھوٹے مقدر سے

نہ کھل جائیں لبِ شیون نہ آنکھوں سے لہو برسے
مگر دنیائے غم حیراں ہے ظرفِ قیسِ مضطر سے
خموشی میں گزاری زندگی عشق اس ڈر سے
کہ دودِ آہِ مجنوں پردۂ محمل نہ بن جائے

اُٹھائی، تربتِ مجنوں پہ دھر دی خاک دل میری
اُڑائی دیدۂ آہو میں بھر دی خاک دل میری
لٹانے کو ہوا کے دوش پر دی خاک دل میری
جلا کر حسن نے برباد کر دی خاک دل میری
یہ ڈر تھا بجھ کے بھی شمعِ سرِ منزل نہ بن جائے

ابھی بے ہوش کر رکھا تھا میرے دل کو حیرت نے
ابھی سیری نہ حاصل کی تھی نظارے کی حسرت نے
جگایا خواب سے گویا مجھے شورِ قیامت نے
یہ کہہ کر پھیر لی مجھ سے نظر اس بے مروت نے
نگاہِ ناز تیری آرزوئے دل نہ بن جائے

یقیناً ہے ثبوتِ عشق کامل ضبط اشکوں کا

کہہ ہے مآنی وفاداری کا حاصل ضبط اشکوں کا
مگر پیدا نہ کردے تازہ مشکل ضبط اشکوں کا
نہ ہو محجوب داغِ دامنِ دل ضبط اشکوں کا
ستارہ زخم کا بڑھ کر رہ کامل نہ بن جائے

۳۰۔ غزل

جولائی ۱۹۳۶ء

حیف دل کا ماجرا صد حیف رودادِ نیاز
آج دستِ آرزو سے چھٹ گیا دامانِ ناز
راز ہے غم، کیسے رسوا کرسکوں گا غم کا راز
حشر میں بھی آہ کیوں جاگے گی تقدیرِ نیاز
یک نفس بھی عیشِ بے غم درخورِ امکاں نہیں
زندگی ہے اور غمِ بے عیش، عمرِ غم دراز
بزمِ الفت میں گدا ہے شاہ کا پہلو نشیں
ہاں یہاں باطل ہے فقر و سلطنت کا امتیاز

آستاں پر بھی نہیں نقشِ قبولِ بندگی
آہ ماؔنی اب کہاں پائینگے ہم دادِ نیاز

۳۱۔ غزل

جولائی ۱۹۳۶ء

روئے روشن ہے ترا جلوہ گر آئینے میں — آج میں دیکھ رہا ہوں قمر آئینے میں
فتنۂ حشر ہے یا نرگسِ آلودۂ خواب — دیکھنا تو کبھی وقتِ سحر آئینے میں
مجھ کو دل میں نظر آجاتا ہے اُن کا جلوہ — نظر آتا ہے اُنھیں بھی، مگر آئینے میں
تیغ پہ برق گری، برق پہ تلوار چلی — ایک نیرنگِ بلا ہے نظر آئینے میں

جلوۂ دوست بنا آبروِ دل ماؔنی
بڑھ گئی اور ضیائے گہر آئینے میں

۳۲۔ غزل

اگست ۱۹۳۶ء

آپ کو کیا جو کوئی آہ کیا کرتا ہے

یوں کوئی پاسِ غمِ اہلِ وفا کرتا ہے

یہ سکوں دشمنیِ ذوقِ بلاہے دلِ زار
شکوۂ ترکِ ستم، شکرِ جفا کرتا ہے

یوں تو ہے جلوہ نمائی کے لئے عذرِ حجاب
خواب میں کیسے یہ احسان ہوا کرتا ہے

نالہ[۱] کرتا ہوں کہ تجھ کو بھی خبر ہو، ورنہ
عشق تو بے ربِ شیون بھی ہوا کرتا ہے

اصل معیار وفا کی ہے رضائے محبوب
یوں تو مانی بھی بہت سعیِ وفا کرتا ہے

۳۴۔ غزل

نومبر ۱۹۳۶ء

ہر طرف شور ہے مانیؔ۔ چمن آرائی ہے

---

[۱] اس شعر کے ترجمے کی کوشش کی گئی ہے
"تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند"

تو بھی پھر درسِ فغاں دے کہ بہار آئی ہے
بے طلب سب نے یہاں دادِ ستم پائی ہے
حشر ہے، نالہ نہ کرنے میں بھی رسوائی ہے
واقعی کچھ نہیں یا کچھ نظر آتا ہی
دلِ مجبور، یہ ظلمت ہے کہ تنہائی ہے
مدعا میرے جنوں کا تو ہے تحسینِ بہار
اور دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہے
آستاں جذبِ جبیں ہے مگر اے فطرتِ عشق
میں ہوں اور حوصلۂ ناصیہ فرسائی ہے
آہ کہ امدادِ تصور سے بھی محروم ہوں اب
اور دل سجدۂ آخر کا تمنائی ہے
سب رہے صرف بدلتا رہا محفل کا نظام
تو ہے اور سلسلۂ انجمن آرائی ہے
سارے عالم کی رقابت کا جنوں ہے مجھ کو
اور بنیادِ جنوں آپ کی یکتائی ہے

تو بھی ہے اُن کے لئے منظرِ عبرت ثانیؔ
جن کا یوں دیدۂ حسرت سے تماشائی ہے

۳۴- غزل

فروری ۱۹۳۷ء

کوئی خواریوں کی طرح خواریاں ہیں ۔ فضائے جہاں ہے مری زاریاں ہیں
جفا سے کھلے اور جوہر وفا کے ۔ دل آرا تمھاری دل آزاریاں ہیں
لچک خود بخود مثلِ شاخِ گلِ تر ۔ اداؤں کی پنہاں ہوا واریاں ہیں
نہ سوزِ جدائی نہ سازِ تمنا ۔ یہ دیوانگی ہے کہ ہشیاریاں ہیں
محبت ہی تھی میری تقدیر، ورنہ ۔ بہت سی زمانے میں بیماریاں ہیں
کبھی لطفِ ظاہر بھی ہوتا کہ مٹتیں ۔ جہاں میں محبت کی جو خواریاں ہیں
میں سمجھا گیا مردِ میدانِ الفت ۔ مرے واسطے ہیں جو دشواریاں ہیں
خوشا فرصتِ بےخودی زیست میں اب ۔ نہ آسانیاں ہیں نہ دشواریاں ہیں

سلگتا ہوں میں جل بجھا قیس ثانیؔ
وہ شعلے تھے اور میری چنگاریاں ہیں

۳۵۔ غزل

مئی ۱۹۲۷ء

ہجر کا غم بھی نہیں، وصل کی پروا بھی نہیں
دل بھی پہلو میں نہیں، دل کی تمنا بھی نہیں

نہیں درکار نہیں مجھ کو غمِ چارۂ غم
ہاں میں دیوانہ ہوں بے شک مگر اتنا بھی نہیں

تم نہ شرماؤ نہ گھبراؤ، میں کہتا بھی ہوں کچھ
ذکرِ وعدہ بھی نہیں خواہشِ ایفا بھی نہیں

جوششِ گریہ اک اعجاز ہے، ورنہ دلِ زار
آخر اک بوند ہے، بادل نہیں دریا بھی نہیں

بے خودی حشر میں کیا یاد دلاؤں گا اُسے
خود مجھے یاد اب اُس شوخ کا وعدا بھی نہیں

وقتِ پرسش ہے ابھی، فرصتِ احسان ہے ابھی
آیئے، میں ابھی زندہ بھی ہوں، اچھا بھی نہیں

اب کہاں لذتِ احساسِ ترقی مانی
یاس میں جذر و مدِ دردِ تمنا بھی نہیں

۳۶۔ غزل

جون ۱۹۳۷ء

رنج کیوں اے ماہِ کنعاں کیجئے — چلئے اشکرِ چاکِ داماں کیجئے
عذرِ بیتابی کا ساماں کیجئے — ہوشِ بے ہوشی پہ قرباں کیجئے
آج پھر رکھ کر بنائے آشیاں — جی میں ہے بجلی کو مہماں کیجئے
بے نیازِ حس ہے میری بے خودی — درد ہی کب ہے کہ درماں کیجئے
قصۂ دل لکھ چکے مانی، بس اب
خوں کے آنسو زیبِ عنواں کیجئے

۳۷۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۷ء

برا کوئی نہیں جس نے بھی کی بھلائی کی

یہی کہو کہ مقدر نے بے وفائی کی
اُس آستاں پہ جبیں تھی کہ آنکھ بند ہوئی
مری فنا ہے بقا، رسمِ جبہہ سائی کی
وہ شوخ بزم میں ہے بے نقاب، جام بکف
الٰہی خیر، مرے عہدِ پارسائی کی
نہ آستاں کوئی شے ہے نہ کوئی چیز جبیں
یہ صورتیں ہیں تقاضائے جبہہ سائی کی
وہ کیوں خفا ہیں مری بے خودی پہ اے مانی
پھر اور دا ہے کیا اُن کی خود نمائی کی

۳۸- غزل

جنوری ۱۹۳۸ء

اشک سے طوفان، فغاں سے حشر برپا کیجئے
آج جی میں ہے کہ تفسیر تمنا کیجئے
کیوں جبیں رکھتے ہوئے در کی تمنا کیجئے

سر جھکا کر آستاں سجدے سے پیدا کیجئے

آپ کی بخشی ہوئی نعمت ہے یہ افسردگی
یوں نہ ہنسیے، اپنے غم کو یوں نہ رسوا کیجئے

سچ ہے بڑھتا ہے تصوّر سے غمِ دوری کا سوز
سوز ہی محبوب ہو دل کو تو پھر کیا کیجئے

پھر جنونِ آشیاں ہے، تنکے پھر چنتا ہوں میں
پھر مقدر ہے کہ بجلی کی تمنا کیجئے

دیر و کعبہ، دشت و دریا، کوہ و صحرا، ہر جگہ
ذرّے ذرّے کا تقاضا ہے کہ سجدا کیجئے

حضرتِ مانی، اگر حق پر نہ آنچ آئے تو پھر
زندگانی تابعِ حالاتِ دنیا کیجئے

۳۹۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۳۸ء

ستم جب صبر کا سرمایۂ اعزاز بن جائے

عجب کیا ہے اگر سوزِ محبت ساز بن جائے
نظر تیری اگر ایمائے ضبطِ راز بن جائے
تو دودِ آہ گھٹ کر سرمۂ آواز بن جائے

نہ کھلنا تو لبِ شیون کا آساں ہے مگر کیا ہو
اگر میری خموشی درد کی آواز بن جائے

جبیں سائی تو پندار آفرینی ہے زہے قسمت
کہ میں سجدہ کروں اور سجدہ تیرا ناز بن جائے

قفس کیا چیز ہے صیاد، ڈر اس وقت نازک سے
کہ رنجِ قید بڑھ کر ہمتِ پرواز بن جائے

حرم میں، دیر میں، رستے میں، گھر میں، آنکھ میں، دل میں
محبت جس جگہ چاہے حریمِ ناز بن جائے

وہ کچھ ہے سرگزشتِ دل کہ اے آنی اگر کہہ دوں
تو امروزِ جہاں فردائے محشر ساز بن جائے

۴۰۔ غزل

فروری ۱۹۳۸ء

دلوں میں درد کی بستی بسائے جاتے ہیں
ہم اک جہانِ محبت بنائے جاتے ہیں

کلیم و برق کی روداد میں کسے ہے کلام
جو آپ برقِ تبسم گرائے جاتے ہیں

اجل ہے سر پہ، خدا حافظ آستانۂ ناز
ہم اُٹھ کے نقشِ پرستش بٹھائے جاتے ہیں

کیا نیاز نے احساسِ حسن کو بیدار
اب اُن میں ناز کے انداز پائے جاتے ہیں

رہِ جنوں سے میں گزرا تھا، مدتیں گزریں
مگر نشانِ قدم اب بھی پائے جاتے ہیں

خود اپنے حسن کا ہے امتحان اُنھیں منظور
ہمیں گماں ہے کہ ہم آزماتے جاتے ہیں

یہ انتظار ہے آنیؔ کہ انتظامِ بہار
برنگِ لالہ ہیں آنسو کہ آئے جاتے ہیں

۴۱۔ غزل

فروری ۱۹۳۸ء

بزمِ ہستی میں سکوں دل کو جو حاصل ہو جائے
خاک اُڑنے لگے برہم ابھی محفل ہو جائے

ڈر یہ ہے دل کشیِ رنگِ ندامت سے ترے
خوگرِ شکوۂ باطل نہ کہیں دل ہو جائے

حسرتِ جلوۂ لیلےٰ میں اگر دیکھے قیس
دشتِ وحشت میں بگولا ہو تو محمل ہو جائے

میرے پاس اب بھی ہیں محفوظ کچھ آدابِ نیاز
نازِ تیرا میں اگر چاہوں تو کامل ہو جائے

یا مرے دل کی تڑپ برقِ تجلی کو ملے
یا تجلی ہی کسی طرح مرا دل ہو جائے

کھیلتا ہوں ابھی طوفانِ بلا سے، ورنہ
جس جگہ ناؤ ڈبو دوں وہی ساحل ہو جائے
موت ہے مرحلۂ آخرِ غم اے مانی
حشر ہے دور اگر اور یہ منزل ہو جائے

۴۲۔ غزل

جون ۱۹۳۸ء

نہ سہی شوق، مگر کیا ہے کہ جلوا بھی نہیں
یعنی کیا اب وہ تجلی گہہِ سینا بھی نہیں
دشمنِ اہلِ وفا، یوں بھی عیادت ہے ثواب
اور میرا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں
ہر طرف تو ہے زہے معجزۂ شوقِ طلب
امتیازِ حرم و دیر و کلیسا بھی نہیں
آرزوئے کرمِ برق کس امید پہ ہو

آشیاں کیسا کہ اس نام سے تنکا بھی نہیں
نامراد آج ہوں نومید ہوں کل اے مانی
عیش امروز نہیں وعدۂ فردا بھی نہیں

۳۴۔ غزل

جولائی ۱۹۳۸ء

خارزارِ شوق میں ہوں، خیر اب جو کچھ بھی ہو
سر کے بل چلنا ہے، اے ذوقِ طلب جو کچھ بھی ہو
حاصلِ ہستی فنا ہے باعثِ ہستی نہ پوچھ
زیست کا انجام ظاہر ہے سبب جو کچھ بھی ہو
پاؤں راہِ عشق میں پیچھے بھی ہٹتا ہے کہیں
دکھ ہو یا آرام راحت یا تعب جو کچھ بھی ہو
حشر تک سراب تو اُن کے در سے اُٹھنے کا نہیں
اِس عمل پر مہربانی یا غضب جو کچھ بھی ہو
ہر گھڑی مانی تغیر سے ہے یہ دنیا دوچار
مستقل کچھ بھی نہیں رنج و طرب کچھ بھی ہو

۴۴۔ غزل

جولائی ۱۹۳۸ء

اجل ہی کاش انجامِ غم و آلام ہو جائے
بلا سے یونہی تسکینِ دلِ ناکام ہو جائے

یہ ظرفِ کائنات اک معرفت کا جام ہو جائے
الٰہی فیضِ صہبائے محبت عام ہو جائے

وہ جلوے کی ہو، یا کوئی تمنا، ضبط لازم ہے
محبت بھی ہوس کی طرح کیوں بدنام ہو جائے

نیاز اب تا بحدِ بے نیازی ہے، اگر چاہوں
تحیر جلوہ بن جائے تصور بام ہو جائے

وہ مے کش ہوں کہ جب پینے پہ آجاؤں تو اے آنی
فضائے میخانہ ہو ہر سانس میری جام ہو جائے

۴۵۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۸ء

بے خودی اب تو سب پہ چھائی ہے بے تماشا یہ خود نمائی ہے
اب یہ بیڑا خدا ہی پار لگائے دل ہے اور غم کی ناخدائی ہے
تجھ کو تابِ نظر نہیں واعظ اس لئے عذرِ پارسائی ہے
ثبت ہے آستاں پہ نقشِ سجود حسنِ تقدیرِ جبہہ سائی ہے
مانگ آنی جزائے محرومی
حشر ہے سب نے داد پائی ہے

۴۶۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۸ء

عقل اے فصل گل اتنی تو ہے دیوانے میں
بھر دیا رنگِ جنوں بھی ترے افسانے میں
ہوشِ وحدتِ نگری ہے ترے دیوانے میں

سجدہ کعبے میں ہے پوجا ہے صنم خانے میں
یہی اول یہی آخر ہے اجالا گھر کا
آگ بجلی نے لگا دی ہے سیہ خانے میں
چلو بے واسطۂ غیر بھی اک سجدہ کریں
کعبہ بھی دیکھیں بہت دن ہوئے بت خانے میں
جلوۂ برق بھی ہے نشۂ صہبا بھی ہے
طور بھی جذب ہے اُس آنکھ کے میخانے میں
ہے کوئی شعبدہ گر، دہر اگر شعبدہ ہے
اک حقیقت بھی ہے کثرت کے اس افسانے میں
ہائے داغوں سے بھی ثابت نہیں بربادیٔ دل
کون مانے کہ چراغاں ہوا ویرانے میں
ساقیا ظرف بھی تیری ہی عطا ہے مے بھی
یہ نہ کہنا کہ سمائی نہیں پیمانے میں
شمع کا حسن بھی ہے شعلہ بدل اے مانی
سوزِ پنہانِ محبت ہے جو پروانے میں

۴۷۔ غزل

دسمبر ۱۹۳۸ء

ہر لمحہ جو یہ دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
اے راہرو ملکِ عدم بانگِ درا ہے

ہاں قیدیِ الفت نہ سمجھنا کہ رہا ہے
یہ موت تو اک منزلِ تجدیدِ وفا ہے

اب منتظرِ وعدۂ فردا جو کیا ہے
کیا تم یہ سمجھتے ہو لحد چین کی جا ہے

اللہ رے مرا ولولۂ ناصیہ سائی
در ہو کہ نہ ہو سر ہے کہ سجدے میں جھکا ہے

میں نے تو کبھی اُف بھی نہ کی اب یہ خموشی
فریاد نظر آئے تو کیا میری خطا ہے

اب شانِ وفا نزع میں آ کر نہ مٹاؤ
انجام وہ ہونے دو جو شایانِ وفا ہے

پیرو ہوں میں اپنے دلِ آگاہ کا آنی
دل آگے ہی اور زیرِ قدم راہِ وفا ہے

۸۴۔ تخمیس

برغزل حضرتِ محبوب سرکار محمد امیر احمد خاں صاحب راجۂ محمود آباد

اپریل ۱۹۳۹ء

لہو پانی ہوا آنسو نہ تھے لیکن رواں برسوں
سلگتا تھا دل اور اُٹھا نہیں دل سے دھواں برسوں
وفورِ غم میں بھی آئی نہ ہونٹوں تک فغاں برسوں
چھپایا ہے قفس میں رہ کے بھی رازِ نہاں برسوں
ارے او باغباں کھولی نہیں میں نے زباں برسوں

رہیں گے اشکِ خونیں دیدۂ تر سے رواں برسوں
یونہی رستا رہے گا دل کا ناسورِ نہاں برسوں
پھنکے گی آہ سوزِ غم سے جانِ ناتواں برسوں
اُٹھے گا اے چمن والو کلیجے سے دھواں برسوں
جلا وہ ایک لمحے میں بنا جو آشیاں برسوں

طبیعت ایک غمگیں ہوتی ہے، اک شاد ہوتی ہے
یہ پابندِ محبت اور وہ آزاد ہوتی ہے
ملیں دونوں تو یک جائی فقط برباد ہوتی ہے
کہاں پہلو نشینی وجہِ استعداد ہوتی ہے
نہ سمجھا معنیِ دردِ محبت رازداں برسوں

کسے پروا گلِ دل کیا ہے، کیا گل چیں و ساقی ہے
سہالا زندگی کا برق کی اک خوش مذاقی ہے
خدا جانے کرم ہے یہ کہ امرِ اتفاقی ہے
نشیمن جل گیا دھبا سا شاخِ گل پہ باقی ہے
رہے گا داغِ دل بن کر نشانِ آشیاں سوں

ذرا انصاف! اگر کچھ امتیازِ حق و باطل ہو
حریفِ نالۂ دل نغمہ سنجیِ عنادل ہو
ہے درکار ایک مدت فردِ ناقص کو کہ کامل ہو
نوائے نوگرفتارِ محبت کیا مقابل ہو
ہمیشہ کے اسیروں سے کہاں وہ دن کہاں برسوں

کسی کے زخمِ دل آئے، کسی کی جان کے لالے
محبت جو مصیبت چاہے جس بندے کے سر ڈالے
کہاں لیکن مجھ ایسے بادۂ الفت کے متوالے
مری پیشانیِ قسمت کو دیکھ لے ہم بھولنے والے
جبیں کی سجدہ گہ تھا تیرا سنگِ آستاں کیسوں
وہ کوئی زیست ہے محبوسِ زنداں رہ کے جو گزرے
بجا ہے تو جو ایسی زندگی کو ختم ہی کر دے
مگر محروم ہو جائے گی دنیا لذتِ غم سے
قفس کی قید میں لے جان دینے والے گھٹ گھٹ کے
ترے نالوں کو ڈھونڈے گا گلستانِ جہاں کیسوں
شکایت ہے فلک سے طالعِ صد فتنہ ساماں سے
گلہ فصلِ خزاں سے، روزگارِ آفتِ جاں سے
فغاں اس قید سے فریادِ اس جورِ نمایاں سے
قفس میں رہ کے بھی باہر رہا صحنِ گلستاں سے
اسیرِ غم نہ بھولے گا جفائے باغباں کیسوں

عنایت کی فلک نے بارِ احساں سے دبا ڈالا
مرے دل میں خیالِ منزل و برگ و نوا ڈالا
مہیا ہو چکا سب کچھ تو آخر کو مٹا ڈالا
ابھی دو دن نہ گزرے تھے کہ بجلی نے جلا ڈالا
میں سمجھا تھا گلستاں میں ہے گا آشیاں سوں
سموم اور خشک پتے، ہو کا عالم، ساز ماتم کا
نسیم اور تازہ گل، ہر پنکھڑی پر جلوہ شبنم کا
سماں وہ ایک مدت کا، یہ ساماں ہے کوئی دم کا
چمن میں رہ کے کیا کیجے توازن شادی و غم کا
بہار آئی اگر دو دن تو ٹھہری ہے خزاں سوں
بیاباں کا نہ مجھے دیوانگی میں جب خیال آیا
مرے پاسِ وفا نے دل کو حکم ضبط فرمایا
مگر جب ضبط کرتے کرتے قلبِ زار گھبرایا
گریباں کی طرح دامانِ صحرا بھی نظر آیا
جنوں میں وحشت کی اڑائیں دھجیاں سوں

کیا جب طائرِ روحِ مقید نے قفس خالی
کہاں تھی اس قدر فرصت کہ ہو شرحِ زبوں حالی
مگر پھر بھی نہ مخفی رہ سکی روداد اجمالی
دمِ آخر کہانی دل کی دو حرفوں میں کہہ ڈالی
رہیں گی یاد عالم کو مری دو ہچکیاں برسوں

نصیب اہلِ دل اُن کی تلون آزمائی ہے
تلطف ہے، تغافل ہے، وفا ہے، بے وفائی ہے
یہ شانِ دورِ قسمت آسماں تک نے اُڑائی ہے
مری تقدیر کی گردش فلک کے کام آئی ہے
رہے گا یونہی چکر میں محیطِ آسماں برسوں

ہے تاثیرِ آہِ عاشق کی دلیلِ پاک دامانی
جو دیکھے بے اثر نالے تو بلبل بھی بُرا مانی
یونہی ناکام ہیں سب میرزا غالب ہوں یا مانی
ہے اوروں کو بھی محبوب ادعائے نالہ سامانی
کوئی کہہ دے ابھی سیکھیں مری طرزِ فغاں برسوں

۹۴۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

پھر اک دم بھر کو اے بجلی میں تیرا میزباں ہوتا
میسر چند تنکوں کا اگر اک آشیاں ہوتا

کرم تم نے کیا، اب لطفِ مرگِ ناگہاں ہوتا
کہ خاموشی میں عمرِ آرزو کا غم بیاں ہوتا

اگر نا آشنائے رسم و راہِ امتحاں ہوتا
عدو کی طرح میں بھی شکوہ سنجِ آسماں ہوتا

بہارِ گل تو آغوشِ خزاں میں ہے مگر آخر
بہارِ عمرِ رفتہ کا کہیں تو کچھ نشاں ہوتا

نہ واماندہ نہ ممنونِ رفاقت، کاش میں یارب
نہ گردِ کارواں ہوتا نہ فردِ کارواں ہوتا

دلِ بدبخت رازِ غم کا زندانِ مقفل ہے
یہ کب کھلتا اگر بالغرض یارائے فغاں ہوتا

محبت ہے چمن سے ورنہ رنجِ آشیاں کیسا
جہاں دو تنکے رکھ لیتا، وہیں اک آشیاں ہوتا
یہ دل کیا چاہتا ہے اور کس منزل پہ ٹھہرے گا
میں خود واقف نہیں ہوں، دوسرا کیا رازداں ہوتا
ابد تک دل نیازِ سجدہ سے فارغ نہیں آنی
یہی ہوتا تو کیوں فرقِ جبیں و آستاں ہوتا

۵۰۔ غزل

اپریل ۱۹۴۰ء

نیازِ دل سے پہلے ناز تھا اتنا کہاں رنگیں
جبیں کی سجدہ ریزی سے ہوا ہے آستاں رنگیں
کیا ہے یادِ فصلِ گل نے دامانِ خزاں رنگیں
سرشکِ خوں ہیں آنکھوں میں، نظر میں ہے جہاں رنگیں
خدا ہی ہے جو آثارِ محبت چھپ سکیں مجھ سے
یہ دل کی سادگی، یہ عشق کا رازِ نہاں رنگیں

چمن سے خانۂ صیاد تک خوں گشتہ دل آئے
اسیروں کی فضا ہے از قفس تا آشیاں رنگیں

نہ ہو کیوں ترجمانِ عشق خونین دیدۂ خونیں
کہ جیسی داستاں رنگیں ہے ویسا ہی بیاں رنگیں

تبسم آپ کا گل ریز بھی ہے نور افشاں بھی
یہ رنگینی ہیں بجلی ہے کہ چمکیں بجلیاں رنگیں

سنا ہے کثرتِ گل سے بھبوکا ہے چمن یارب
ارے شعلوں ہی سے ہونئیں قفس کی تیلیاں رنگیں

نہیں، تجھ کو بیانِ گریۂ خونیں سے کیا مطلب
مرادامن تو خود پایا گیا اے رازداں رنگیں

یہ کس نے خاک اُڑا رکھی تھی یا آئی صحنِ گلشن میں
کیا پھر کس نے دم بھر میں سوادِ بوستاں رنگیں

۵۱- غزل

اکتوبر ۱۹۴۰ء

بے نیازی کا یہ پیدا کیا عنواں ہم نے

کنجِ عزلت میں کیا یاس کو مہماں ہم نے
موت کو سمجھا ہے فرمائشِ پیماں ہم نے
ابدی عہدِ وفا باندھ کے دی جاں ہم نے

دیکھ لیں وہ بھی ذرا آئینہ پردازیِ حسن
اس لئے پیش کیا ہے دلِ حیراں ہم نے

کوئی مسلک ہو، محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
راہ ڈھونڈھی ہے یہ اے گبر و مسلماں ہم نے

اک تمنائے خلش تھی جسے دل سمجھے تھے
آرزو پائی ہے پا کر ترا پیکاں ہم نے

ہوتے رہتے ہیں ادا جلوۂ جاناں کے حقوق
ہوش ہوئے نے کیا نذر، تو دی جاں ہم نے

آستیں اپنی اب آنکھوں پہ رکھیں یا دامن
جا بیٹھے چھوڑ دیا گوشۂ داماں ہم نے

اب وہ سر اُٹھ نہیں سکتا جو کبھی جھک سکا
دیکھ لی آج گراں بارِیِ احساں ہم نے

سچ ہے مانی، وہی جلوہ، وہی سازِ حیرت
خیر، پایا ہے دلِ آئینہ ساماں ہم نے

غزل-۵۲

ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء

رد ہو گیا سجدہ مری فرسودہ جبیں کا
اے دربدری، تو نے تو رکھا نہ کہیں کا

اللہ یہ اوج اخترِ اربابِ یقیں کا
نقشِ قدمِ یار نوشتہ ہے جبیں کا

یہ وقت نہ آتا نہ تم آتے سرِ بالیں
احسان ہے تمہارا کہ دمِ بازپسیں کا

ظاہر ہے کہ ہستی مری کچھ بھی نہیں جز وہم
پھر بھی مجھے اس وہم پہ دھوکھا ہے یقیں کا

تیرا تو قدم سوئے فنا بڑھتا ہے اے دل
اچھا تو ٹھہر، میں بھی مسافر ہوں وہیں کا

کی موت نے بھی پیش وہی راہِ محبت
میں سمجھا تھا اے دل یہ طریقہ ہے یہیں کا
ہیں اور کہیں کا ہوں، یہ اک راز ہے آنی
میرے ہیں یہ سب، میں نہیں افلاک و زمیں کا

۵۳۔ غزل

نومبر ۱۹۴۱ء

اے جنوں، پھر اک نظر دنیائے ویراں کی طرف
دن پھریں گلشن کے، ہیں جاؤں بیاباں کی طرف
جب نگاہِ شوق اٹھ جاتی ہے پیکاں کی طرف
کھنچ کے آجاتا ہے خود پیکاں رگِ جاں کی طرف
یہ اجل ہے یا حیات، تو کہ وہ بالیں پہ ہیں
میرا دم آنکھوں میں ہے، آنکھیں ہیں جاناں کی طرف
نعمتیں بخشیں، خطائیں بخشیں، اللہ رے کرم
اپنے کو دیکھوں کہ دیکھوں اس کے احساں کی طرف

رخصتِ فصلِ بہار اے ہم قفس میرا گناہ
آنکھ بھر کر میں نے کیوں دیکھا گلستاں کی طرف

پھاڑ دوں گا جامۂ اصلی بھی میں اے بخیہ گر
رخ گریباں کا نہ رکھ ظالم رگِ جاں کی طرف

موت میں نے نام رکھا داستانِ عشق کا
زندگی لکھی ملی، دیکھا جو عنواں کی طرف

بس بس اے جوشِ جنوں کھینچے لئے آتا ہوں میں
باغ کو زنداں میں زنداں کو بیاباں کی طرف

زندگی ہی ختم ہے اے ہمتِ مشکل پسند
خیر باد اب جا رہا ہوں راہِ آساں کی طرف

ہوتی ہے وابستہ دنیا سے بھی لے علا کی غرض
دیکھئے پیغمبری اور چاکِ داماں کی طرف

اُف، یہ امواجِ بلا ثانی، یہ تیرا حوصلہ
اک قطرۂ دل کی طرف ہے ایک طوفاں کی طرف

۵۴۔غزل

اپریل ۱۹۴۲ء

ہر قدم پر شوقِ منزل کی فراوانی تو ہے
راہِ دشوارِ محبت میں یہ آسانی تو ہے

بے شک اس جینے سے مرجانے میں آسانی تو ہے
لیکن اے دل مرضیِ قاتل کی قربانی تو ہے

سچ ہے شیون سے مرے اُن کو پریشانی تو ہے
لیکن آخر وردِ عذرِ نالہ سامانی تو ہے

کامیابی ہو نہ ہو، بیٹھا نہ رہ تدبیر کر
مدعا بس میں نہیں ہے سعیِ امکانی تو ہے

آج یہ تسکین کافی ہے کہ کل روزِ جزا
روئدادِ زیست کہہ کر دادِ غم پانی تو ہے

ہاں یہاں یہ ہے کہ مقصود و تمنا ساتھ ہیں
ورنہ یہ جنت ہماری جانی پہچانی تو ہے

ایک ظرفِ دل ہے، اس میں دوئی کی گنجائش کہاں
دور اے جمعیت خاطر، پریشانی تو ہے

ہاں برے کو بھی نہ ایذا دے کہ اس کی ذات میں
خوئے انسانی نہیں ہے، روحِ حیوانی تو ہے

رہ نمائی عقل سے چاہی شروعِ عشق میں
عفو کر اے بے خودی، یہ میری نادانی تو ہے

دیکھئے بازارِ محشر میں یہ کن داموں بکے
جنسِ غم کی خیر سے دنیا میں ارزانی تو ہے

اور نکلے گی کوئی تدبیرِ پیراہن دری
ہوں جو شل ہیں ہاتھ، شوقِ چاک دامانی تو ہے

آئینے میں اقتدارِ حسن کی صورت کہاں
آئینہ رکھ دے، ادھر آ، میری حیرانی تو ہے

ان کو کیا لوٹے کسی کا دل کہ رسوا ہو کوئی
خوش رہیں یوسف کہ ثابت پاک دامانی تو ہے

کس غرض سے پھر گوارا کیجے تکلیفِ ضبط

راز رکھ کر بھی محبت کی سزا پائی تو ہے

اہلِ دل سے یہ جہاں خالی بھی رہتا ہے کہیں
عرفیؔ و غالبؔ نہیں، فانیؔ نہیں، مانیؔ تو ہے

۵۵۔ غزل

جون ۱۹۴۲ء

یہ لے دل ماسوا کی یاد، وقتِ واپسیں کیسی
اجل بے واسطہ سجدہ ہے، در کیسا جبیں کیسی

ستارے، ذرے، خورشید و قمر، دنیا و مافیہا
تجلی ہر جگہ ہے، دشتِ ایمن کی زمیں کیسی

خوشی جس بات میں تیری، اُسی میں ہے رضا میری
نہیں لاؤ نعم سے بحث، ہاں کیسی، نہیں کیسی

جہنم ہو جزا تو بھی مجھے منظور ہے یارب
تجھے سجدہ کروں گا، آرزوئے حورِ عیں کیسی

اُداسی زیرِ دامانِ فلک ہر شے پہ چھائی ہے
یہ مانیؔ چشمِ تر پہ تو نے رکھ لی آستیں کیسی

غزل ۵۶

اکتوبر ۱۹۴۲ء

نقوش آنی کے دیباچے میں دو شعروں کی شانِ نزول

درج ہے۔

"آب نسیاں کیا ہے... الخ۔ اور "میرے نالوں کا اثر ہے... الخ

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ایک خاتون کی فرمائش سے پانچ شعر اور کہے

گئے اور یوں سات شعروں کی غزل ہو گئی۔ آنی۔ جائسی

حیف، سازِ بوسۂ دلبر بنے اور ٹوٹ جائے

یعنی میری خاک کا ساغر بنے اور ٹوٹ جائے

کاش ہو میرے مقدر میں یہ سامانِ خلش

دل میں آ کر وہ نظر نشتر بنے اور ٹوٹ جائے

اے تصور آہ، تیری سعی بھی بے سود تھی

یوں طلسمِ صحبتِ دلبر بنے اور ٹوٹ جائے

وائے محرومی قسمت رشتۂ اُمیدِ وصل

ہجر میں کس طرح جُڑ جُڑ کر بنے اور ٹوٹ جائے

"آبِ نیساں کیا ہے، یاں ہر قطرہ میرے اشک کا
آتے آتے طشت تک گوہر بنے اور ٹوٹ جائے"

"میرے نالوں کا اثر ہے ورنہ کیا ممکن ہے یہ
غیر کا کوچے میں اُس کے گھر بنے اور ٹوٹ جائے"

کس قدر جلدی کہی بچپن میں اے آنی غزل
اب تو بنتا ہی نہیں، کیونکر بنے اور ٹوٹ جائے

۵۷۔ غزل

نومبر ۱۹۴۲ء

مری زندگی قفس ہے، نہیں واقف آشیاں سے
اگر آشیاں کہیں تھا، تو یہ پوچھو باغباں سے

تنِ آگہی نہ بخشے جنھیں سوزشِ نہاں سے
انھیں کیوں کرے پریشاں کوئی شرحِ داستاں سے

میں خموش ہوں تو اب وہ مری بات پوچھتے ہیں

ہوا ضبط سے وہ حاصل جو نہ ہو سکا فغاں سے

مری روح کا ازل میں ہوا عشق سے تعارف
ترا غم وگرنہ پاتا مجھے کیسے اور کہاں سے

ہے فنا فتادگی میں، مرے اشک ہوں کہ سجدے
اِنھیں میری آستیں سے، اُنھیں تیرے آستاں سے

میں ہٹا تو لوں جبیں کو ترے سنگِ در سے لیکن
یہ وقارِ حسن اُٹھے گا جو اُٹھا سر آستاں سے

قدر و قضا کی طاقت ہوئی دہر میں مسلّم
یہ ادا ہوئی ہے خدمت مری سعیِ رائگاں سے

نظر اُٹھ کے دے رہی ہے جو یہ دعوتیں گنہ کی
کبھی اس بلا کو جھیلیں، ملک آ کے آسماں سے

ہے امانِ صحنِ گلشن، مرے آشیاں کا جلنا
کسے پہونچنے کو آئی اگر سے برق آسماں سے

۵۸۔ غزل

اپریل سنہ ۱۹۴۳ء

راہِ وفا میں لوٹا گیا دل ہے ہے مرا دل، بیکس مرا دل
روزِ ازل یوں پیدا ہوا دل لی غم نے کروٹ اور بن گیا دل
ہر دشمنِ جاں اہلِ وفا ہے اک باوفا تم، اک باوفا دل
دل جی رہا ہے غم کے سہارے جب مٹ گیا غم، سمجھو مٹا دل
تم دل میں ہو یا تصویرِ حیرت تصویرِ حیرت یا ہے مرا دل
سنسان محفل ویران پہلو رخصت ہوئے تم رخصت ہوا دل

ٹوٹا نہ آخر صدمے سے مانی
شیشے سے بھی تھا نازک مرا دل

۵۹۔ غزل

مئی سنہ ۱۹۴۳ء

طرفہ رنگِ جہانِ فانی ہے ہر حقیقت یہاں کہانی ہے

آفتِ عالمِ دگر ہے عشق یہ نہ ارضی نہ آسمانی ہے
ابھی اور التجا کرو موسیٰ یہی منشائے لن ترانی ہے
نہیں موت انتہائے عالمِ دل دل تو دنیائے جاودانی ہے
زندگی کیا ہے، حشر کی تمہید حشر کیا شرحِ زندگانی ہے
آئی موجِ ہوا اُسے خلد گئی اب جوانی کہاں کہانی ہے

آج آفی ستم کی داد کہاں
شکر کر، کل تو سواد پانی ہے

۶۰۔ غزل

اکتوبر ۱۹۴۲ء

کہیں قسمت پلٹتی ہے فغاں سے بچھڑ ہی کر رہے ہم آشیاں سے
خموشی کام لے دردِ نہاں سے اثر برباد ہوتا ہے فغاں سے
نظر کی اُس نے نازِ جاں ستاں سے چلو پیچھا چھٹا عمرِ رواں سے
یہ صورت نور کی اور عالمِ خاک خدا کی شان، تم آئے کہاں سے
توقع ہے کہ بارِ غم اُٹھائے یہ کس سے، میری جانِ ناتواں سے

یہ کم سے کم ہے ذوقِ جبہہ سائی نہ اُٹھے سر، میں اُٹھ جاؤں جہاں سے
چمن والوں کو اب کیا برق سے ڈر اُسے تو ضد تھی میرے آشیاں سے
جھکا ہے جان کر پہچان کر سر یہ ہٹنے کا نہیں اب آستاں سے
جو ممکن بھی ہو ترکِ عشق مانیؔ
تو کیا باز آؤں لطفِ جاوداں سے

۶۱۔ غزل

اکتوبر ۱۹۴۴ء

سچ ہے کہ اشک آنکھوں میں، لب پر فغاں نہیں
یہ تو مگر غلط ہے کہ دردِ نہاں نہیں
ذوقِ نظر کے واسطے قیدِ مکاں نہیں
آنکھیں تو کھول، وادیِ ایمن کہاں نہیں
بے وقفہ ایک جادۂ نو پر ہوں گام زن
یعنی اجل بھی منزلِ عمرِ رواں نہیں
دل آدمی کی جان ہے، جب دل میں درد ہو
کیا کہیئے پھر کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں

ہر گام دعوتِ گنہ و جبرِ ضبط ہے
میرا ہے اے ملک یہ ترا امتحاں نہیں
صیاد، فکرِ باغ نہ کر، گھر کی خیر مانگ
میرے قدم تو آج یہاں ہیں، وہاں نہیں
مانی کسی جگہ بھی لجھ کا دے سرِ نیاز
جب ضامنِ قبولِ سجود آستاں نہیں

۶۲۔ غزل

دسمبر ۱۹۴۴ء

یہ ہوا نے آ کے چراغِ شامِ فراق میرا بجھا دیا
کہ خموش ہو کے چراغ نے مرے دل کو درسِ فنا دیا
کٹی ساری عمر اک آہ سرد اک اشکِ گرم کے ضبط میں
یہی تھا خلاصہ داستانِ الم، سو آج سنا دیا
ملی فطرتِ ہمہ جستجو، دیا اک دلِ ہمہ آرزو

بس اب اور کچھ بھی نہ مانگ تو، جو کچھ ایک بار دیا دیا
غمِ تازہ قسمتِ ہر نفس، ہوس اور زندگی قفس
ترا شکر میرے کریم بس جو دیا وہ حد سے سوا دیا
تجھے مصلحت کی خبر ہو کچھ تو بتا دے آنی دل حزیں
دل مبتلا جو عطا کیا تو نصیب کیوں نہ رسا دیا

غزل ۶۳

جون ۱۹۴۵ء

آنکلا دلِ طالبِ انصاف ادھر بھی
مقصود بھی محشر ہی تھا اور راہگزر بھی
لے ساتھ شبِ ہجر کو اور جی سے گزر بھی
اے دل کہیں اس رات کی ہوتی ہے سحر بھی
کیا پوچھتے ہو حشر تو ہونا ہی ہے اک دن
مل جائے گی آوارۂ الفت کی خبر بھی
بیگانۂ منزل ہے دل درپئے منزل

ہاں کب ہے یہ لازم کہ دعا میں ہو اثر بھی
احسان ہے بیمار پہ آئے ہیں مگر کب
جب تابِ سخن گیا، نہ رہی تابِ نظر بھی
دونا ہے غمِ ہجر شبِ ماہ میں ساقی
یہ کم ہو تو مے دے کہ پیوں خونِ جگر بھی
انداز جدا گانہ مگر حمد میں سب محو
کہسار بھی دریا بھی ستارے بھی قمر بھی
آنکھوں میں بھی تو پھرتا ہے دل میں بھی بسا ہے
راہیں بھی ترے جلوے سے آباد ہیں گھر بھی
منزل قدمِ سعی کی پابند ہے مآنی
رک جائے جہاں پاؤں وہیں ختم سفر بھی

۴۶۔ غزل

جون ۱۹۴۵ء

کفر سے انحراف ہے درخورِ دیں یقیں نہیں

دیر و حرم تو ہیں مگر میری جگہ کہیں نہیں
تیرا گلہ تو کیا کروں، وقت پڑا ہے اے جنوں
پونچھنے کو سرشکِ خوں دامن و آستیں نہیں
یاس کی منزل آ گئی، دل ہے سکوں سے ہم کنار
جذر و مدِ امید و بیم اب دمِ واپسیں نہیں
سر بھی اٹھانے دے کہیں وضعِ نیازِ عاشقی
لائقِ آستانِ ناز، فرض کرو جبیں نہیں
دیر و حرم کی بحث کیا، چاہے جہاں بھی سر جھکا
عشق ہے بندۂ وفا، تابعِ کفر و دیں نہیں
ہاں نہ کہو کہ مٹ نہ جائے لذتِ وعدہ کی امید
بڑھنے دو عمرِ آرزو، کہتے رہو نہیں نہیں
آنی زار رہی کا عشق آپ کا نازِ حسن ہے
عشق اگر اسے نہیں، آپ بھی پھر حسیں نہیں

۶۵۔ غزل

ستمبر ۱۹۴۷ء

موت ہاں برحق ہے لیکن زندگی فانی کہاں
قصۂ ہستی بہ انجامِ تن آسانی کہاں

آپ کے سجدے میں روحِ سجدہ ہائے آنی کہاں
کاش یہ احساس ہوتا غم ہے پیشانی کہاں

مشکلوں سے روح کو مانوس ہونا چاہئے
زندگی دشواریوں ہی میں ہے آسانی کہاں

اے زلیخا برتر از انسانیت کا ذکر چھوڑ
درد سے بیگانہ رہنا کارِ انسانی کہاں

تشنۂ مقصود دھوکھا ہے جھلک امید کی
صرف اک منظر سراب آسا ہے یہ پانی کہاں

کاٹ دی بستر پہ انگاروں کے ساری زندگی
اے تمنا اس سے بڑھ کر کوئی قربانی کہاں

منزلِ حیرت میں لایا امتحانِ تابِ دید
دیکھئے لے جائے گی اب دل کی حیرانی کہاں
کثرت و وحدت میں نسبت ہے شعاع و شمس کی
ایک ہی جلوہ ہے جلووں کی فراوانی کہاں
مٹ کے میرے گھر کی رونق عالمِ عبرت بنی
دشت بھی ویراں ہے لیکن لطفِ ویرانی کہاں
عیشِ آزادی کبھی ملتا تو ہوتا رنجِ قید
مستقل جمعیتِ دل ہے پریشانی کہاں
یہ فضائے فکر اے آنی ہے معراجِ سخن
اب مگر تخئیل میں وہ برق سامانی کہاں

غزل ۔ ۶۶

دسمبر ۱۹۴۲ء

جوارِ زیست میں ہر پھر کے اکثر وہ مقام آیا
رفیق و آشنا کوئی نہ جس منزل پہ کام آیا

اک ایسا اُن کی چشمِ مست سے رنگیں پیام آیا
دلِ مایوس نے خود ہو کے بول اُٹھا، وہ جام آیا

بظاہر جاں ستاں تھا عشق لیکن جاں فزا نکلا
پیامِ مرگ بن کر مژدۂ عمرِ دوام آیا

سب اس کو جان ہی کہتے ہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں
کہ یہ کس کے لئے لب تک مرے دل کا پیام آیا

سرورِ عشق باقی ہے، خمارِ کامرانی کیا
محبت میں مرا ناکام ہی رہنا تو کام آیا

جنوں کی پختہ مغزی کو خزاں کیا فصلِ گل کیسی
کبھی سر میں تفاوت کا نہ یہ سودائے خام آیا

یہ حالِ نزع ہے یا حسنِ انجامِ محبت ہے
نظر میں اُن کی تصویر آئی لب پر اُن کا نام آیا

درِ جاناں سمجھ کر سر وہیں سجدے میں خم کر دو
دلِ آگاہ جب کہہ دے مقامِ احترام آیا

نظر کی وقتِ آخر یا سرور سرمدی بخشا

سرِ بالیں تمھارا نزع میں آنا بھی کام آیا

ابد تک رہ روی ہی کیا مری قسمت میں ہے یارب
ابھی تک تو نہ منزل ہے نہ در آیا نہ بام آیا

دل آغوشِ فنا میں کروٹیں لینے لگا آنی
یہ جان آئی کہ تربت پر کوئی محشر خرام آیا

۶۷۔ غزل

اگست ۱۹۴۸ء

دادِ مجبورِ نیازِ عاشقی مل جائے گی
ایک دن بنیادِ نازِ حسن بھی ہل جائے گی

نفع کیا ہوگا جو نالوں سے زمیں ہل جائے گی
گوشِ گل تک جب فریادِ عنادل جائے گی

صبر ہی سے کام لے آمادۂ شیون نہ ہو
یہ صدائے خامشی تا عرش لے مل جائے گی

ہمتِ مردانۂ و عزمِ مصمم چاہیئے

منزل آجائے گی، دشوارئ منزل جائے گی

خندہ زن کیوں ہے کسی کے حال پر غنچہ یہ
جلد مرجھانا ہے اُس کو جو کلی کھِل جائے گی

کار فرما ہے ہوائے عشقِ لیلےٰ دیکھنا
اُڑتے اُڑتے فلکِ مجنوں تا بہ محمل جائے گی

رکھے گی خاکسترِ پروانہ روشن تیرا نام
روشنی تیری اگر اے شمعِ محفل جائے گی

حق تو چھانے کو ہے عالم میں مگر چھائے گا کب
یاالٰہی کب جہانگیرئ باطل جائے گی

چاہے چھپ چاہے عیاں ہو بدرِ بجلی ہے نکل
تیرگی دل کی کہاں اے ماہِ کامل جائے گی

اور دم بھر ضبط لے ثاقب کہ ہوگا مضحکہ
جب تڑپنے کی خبر تا کوئے قاتل جائے گی

۶۸ غزل

فروری ۱۹۴۹ء

لب پہ عیشِ عہدِ ماضی کا ہے افسانا ہنوز
جا چکی ہے فصلِ گل اور میں ہوں دیوانا ہنوز

چین کیسا قبر میں سر پر ہے روزِ بازپرس
داستانِ دردِ ہستی کو ہے دوہرانا ہنوز

اب بھی شرحِ سوزِ دل کرتی ہے پروانے کی خاک
سن رہی ہے شمع خاموشی سے افسانا ہنوز

پھینک دی ساری شراب اے وائے بے صبریِ شوق
لب تک آنے بھی نہیں پایا تھا پیمانا ہنوز

کیا مٹے امیدِ تاثیرِ دعا کا اضطراب
دل ہے شانِ رحمتِ باری کا دیوانا ہنوز

زندگی آخر ہوئی لیکن ہوس کی حد نہیں
قبر بننے کو ہے اور بنتا ہے کاشانا ہنوز

نا امیدی بھی مداوا بے قراری کا نہیں
مشغلہ دل کا ہے تم کو یاد فرمانا ہنوز

عمر بھر کھایا فریبِ دوستی لیکن یہ دل
رسم و راہِ اہلِ عالم سے ہے بیگانا ہنوز

زیست کی ہر سانس ہوتی ہے ہم آغوشِ فنا
ہر نفس ہے موت اور باقی ہے مر جانا ہنوز

کہتے کہتے عرصۂ محشر تک آیا ہوں مگر
نامکمل ہے غمِ ہستی کا افسانا ہنوز

پیہم آنکھوں کا جھپکنا کیا جز ایمائے نجود
ان اشاروں سے مگر مآنی ہے بیگانا ہنوز

۶۹۔ غزل

مارچ ۱۹۴۹ء

اک سانس پاک پائیں اگر مدعا سے ہم
منزل کبھی نہ پوچھیں دلِ رہ نما سے ہم

ہوتے ہیں شکوہ سنجِ مصائب خدا سے ہم
کس درجہ نابلد ہیں رموزِ بلا سے ہم

یعنی تجھے گماں تو ہو اہم پہ عشق کا
خوش ہیں ترے تغافلِ تاب آزمائے ہم

اب کھل گیا کہ درد ہے رازِ حیاتِ دل
اب آشنا ہوئے دلِ درد آشنا سے ہم

کیوں آرزو کے ساتھ ہو اک اور آرزو
رکھتے نہیں اثر کی توقع دعا سے ہم

واعظ یہ دل ہے اور معارف کی منزلیں
آگے ہیں تیرے پندِ حقائق نما سے ہم

سمجھے کہ اضطرابِ مسلسل ہے زندگی
اے دل ترے دھڑکنے کی پیہم صدا سے ہم

باران و برق و باد ہے اور اپنا آشیاں
سب کچھ تو دیکھتا ہے، کہیں کیا خدا سے ہم

منزل نئی ہے لطف کی اللہ خیر ہو

مانوس ہو چکے تھے اب اُن کی جفا سے ہم
آوازۂ فنا ہے نوائے شگفت گل
سنتے ہیں انتہا کی خبر ابتدا سے ہم
آنی کمالِ رہبری عشق کچھ نہ پوچھ
رستہ بقا کا پا گئے دارِ فنا سے ہم

۷۰۔ غزل

اپریل ۱۹۴۹ء

غمِ دنیا کہیں کرتا ہے فراموش مجھے
لے ہی آیا طرفِ درس گہِ ہوش مجھے
میں نے مانا کہ وفا کیش نہیں ہوں لیکن
یہ تو کہہ دو کہ سمجھتے ہو وفا کوش مجھے
سر پہ ہو سایہ رحمت بھی تو اللہ سے ڈر
ابر کہتا ہے سمجھ صاعقہ بردوش مجھے
حال افسردہ ہو کیوں تذکرۂ ماضی سے

عیشِ امشب میں نہیں یادِ غمِ دوش مجھے

آشیاں میں بھی تو ہے برق کا ڈر لئے مآنی
امن آتا ہے نظر فتنہ در آغوش مجھے

۱۷۔ غزل

مئی ۱۹۴۹ء

بندہ مجبور بھی ناواقفِ مفسوم بھی ہے
تم ہو مختار بھی سب کچھ تمھیں معلوم بھی ہے

کیا یہ کم ہے پئے تسکیں کہ خدا ہے موجود
دل جو بے تاب ہے اس کا کوئی مفہوم بھی ہے

دل ترا بندۂ فرمان ہے میں بندہ دل کا
میرا حاکم تو ہے لیکن ترا محکوم بھی ہے

جاں بلب ایک طرف درد سے تیرے بیمار
چارہ سازی کی تری ایک طرف دھوم بھی ہے

ہے خطا لازمۂ نقصِ بشر اے مآنی
ورنہ انسان جو کامل ہے وہ معصوم بھی ہے

۷۲ ۔ جمہوریت ہند

جنوری ۱۹۵۰ء

کمال قدرتِ خالق ہے وضع انسانی
کہاں اس اشرفِ مخلوق کا کوئی ثانی
ہے اس میں فیصلہ کن عقل کی فراوانی
رسا ہے تا بحدودِ فضائے امکانی
اسے خرد اسے تمیز نیک و بد کی ملی
اور اس کے ساتھ ہی قدرت قبول و رد کی ملی
بھلائی بھی اسی دنیا میں ہے برائی بھی
کدورتیں بھی اسی میں ہیں اور صفائی بھی
جہاں میں راہ زنی بھی ہے رہنمائی بھی
یہاں وفا کے بھی جلوے ہیں بے وفائی بھی
مگر خرد حق و باطل میں فرق کرتی ہے
یہی ہے جو یم و ساحل میں فرق کرتی ہے

اب اسے عزیز بہ فتوائے عقل و حکم شعور
سمجھ لے رتبۂ مختار و درجۂ مجبور
غلام بن کے امیری نہ لے اگر ہے غیور
کہ ایسے شخص سے بہتر ہے سلطے تو امزدور
برائے روح بشر تقویت ہے آزادی
ازل سے فطرتِ انسانیت ہے آزادی
بشر ہیں ہم بھی غلامی سے ہم بھی تھے بیزار
مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کوئی چارۂ کار
اٹھا نہ اپنے اکابر سے جب یہ ننگِ عار
ہوئے بہ جوشِ عمل رہ روِ رہ ایثار
ہوئیں جو زندگیاں صرفِ جہد آزادی
تب آج ہم کو ملا ہے یہ عہدِ آزادی
مدبروں نے دلوں میں عمل کی جب ٹھانی
نکل کھڑے ہوئے سج کر سلاحِ قربانی
اٹھائی زحمت و دشواری و پریشانی

ملی نتیجے میں آخر یہ فتح سامانی
ہے درج دفترِ آزادگاں میں نام اپنا
کسی سے کم نہیں دنیا میں اب مقام اپنا
وہ عہد اب نہیں جب تلخیاں تھیں قسمت میں
نہیں وہ دن جو گزرتے تھے رنج و کلفت میں
کہاں وہ وقت جو کٹتا تھا خوف و ذلت میں
گیا وہ دور کہ ہم مبتلا تھے نکبت میں
نہ اب تسلطِ شاہی نہ اب وہ مجبوری
ہے آج ملک میں رائج نظامِ جمہوری
عظیم اور بلاخیز انقلاب آئے
جب اہلِ ملک نے جمہوریت کے حق پائے
یہ ملک اپنے اکابر کے کیوں نہ گن گائے
جنھوں نے سعی سے اپنی حقوق دلوائے
بلند رتبہ ممالک کے ہم وقار ہیں ہم
پسندِ صدر میں بھی اہلِ اختیار ہیں ہم

کوئی نظام کہاں اس نظام کے پاسنگ
تمام ہو گئی سرمایہ اور فقر کی جنگ
مساویانہ حقوق اور مساویانہ اُمنگ
نہ امتیازِ مذاہب نہ فرقِ ملت و رنگ
ہے اس نظام میں یہ احترامِ آدمیت
نہیں ہے آدمیت اب غلامِ آدمیت

ہوئی ہے صدیوں کے بعد اب یہ آرزو پوری
کہ ملک ہند ہے آج اور نظام جمہوری
ملی ہر اک برکت، معنوی ہو یا صوری
الگ جواب ہیں مبارک رہے انہیں دوری
یہاں حکومتِ ہندی کا فیض جاری ہے
ہمیں ہے ناز کہ یہ سلطنت ہماری ہے

۳۷۔ غزل

فروری ۱۹۵۱ء

ابتدا اب ہونے ہی والی ہے دورِ جام کی
انتہا تو ہو چکی ہے گردشِ ایام کی

حشر تو ہونا ہے لیکن حشر میں پوچھے گا کون
بات دل کی خاص کر میرے دلِ ناکام کی

وعدۂ فردا ہے میں ہوں اور کربِ انتظار
قبر ہی اے کاش ہوتی اک جگہ آرام کی

روح پرور نورِ رخ بھی ظلمتِ گیسو بھی ہے
صبح روشن کی صفت ہو یا سہانی شام کی

وقت کا رنگ اور نیرنگِ مزاجِ عشق دیکھ
سعی تھی آغاز کی تشویش ہے انجام کی

آج بھی باقی ہے کوئی دیدہ ور زیرِ فلک
بے تماشا ورنہ رہ جاتی تجلی بام کی

ماضی و مستقبل و شام و سحر کچھ بھی نہیں
حال میں ہوں کیا خبر آغاز یا انجام کی
تم اُسے سمجھو نہ سمجھو لیکن اے اہلِ خرد
بات دیوانے بھی کہہ جاتے ہیں اکثر کام کی
ہے معین وقت تک آنی وہ دولت ہو کہ زور
درسِ عبرت ہے کہانی قیصر و بہرام کی

۴۷۔ غزل

مارچ ۱۹۵۰ء

اُمید کی کش مکش سے اللہ دل کو فرصت کبھی ملے گی
ہے یاس میں بھی اُمید باقی، جزا کچھ اس یاس کی ملے گی
اگر میں ناکام دید مر جاؤں اپنے کوچے میں دیکھ لینا
وہیں کہیں خاک و خوں میں غلطاں مری تمنا پڑی ملے گی
بہوش باش اے مسافرِ راہِ زندگی، یہ وہ راستہ ہے
جہاں تجھے رہبری کی صورت میں جابجا رہزنی ملے گی

نہ آج خوش ہوں نہ علم فردا، رہی بس اب ایک یادِ ماضی
سو فرض کر لو کہ عیش ہی تھا، تو یاد میں کیا خوشی ملے گی

بہ رہ نمائے ہوش طے کر ابھی تصور کی منزلوں کو
جہاں تصور سے بے نیازی ہے اس جگہ بے خودی ملے گی

غضب ہے موت اور زندگی سب ہے کل کے وعدے کے آسرے پہ
کوئی خدارا یقیں دلا دے کہ دادِ غم آج ہی ملے گی

یہ سچ ہے دنیا ہے آنی جانی، مگر یہ بزمِ جہانِ فانی
ہمیشہ خالی ہے جائے ماَنی ہمیشہ اس کی کمی ملے گی

۵۷۔ غزل

مئی ۱۹۵۰ء

یہ کون مانے کہ نا آشنائے راز ہے تو
مگر یہی کہ خداوندِ بے نیاز ہے تو

اُس آستاں پہ جو سر ہی تو سرفراز ہے تو
نیاز مندیٔ عالم سے بے نیاز ہے تو ـــ

سمجھ میں آئے نہ آئے ادائے چارہ گری
مجھے تو ہے یہ بھروسا کہ چارہ ساز ہے تو

فنا نہیں ہے اجل، عمرِ جاودانی ہے
وجود ہے وہ حقیقت کہ جس کا راز ہے تو

قبول کر مری داد لے مری سیہ بختی
حریفِ ظلمتِ تنہائیے دراز ہے تو

نوازشیں تری مبہم سہی مگر اے دوست
یہ اعتبار ہے کیا کم کہ دل نواز ہے تو

بڑے مراحلِ دشوار سے گزرنا ہے
نیاز جادہ ہے اور منزلِ نیاز ہے تو

یہ مانتا ہے زمانہ کہ میں ہوں نازشِ صبر
یہ راز کوئی نہ سمجھا کہ میرا ناز ہے تو

ہے سرخوشی میں تجھے پاسِ غم کشاں مانی
عجیب رندِ خدا ترس و پاک باز ہے تو

۷۶۔ صفی کی یاد میں

اکتوبر ۱۹۵۰ء

دل کی دھڑکن جادۂ ہستی میں ہے بانگِ جرس
اک قدم سوئے فنا بڑھتا ہے رہرو ہر نفس

طے مسلسل ہوتی ہے راہِ عدم بے پیش و پس
زیست کی منزل ہے موت اللہ بس باقی ہوس

خود قدم بڑھتے ہیں، رک جانا نہیں امکان میں
راستہ چلتے رہو، ہے جان جب تک جان میں

زندگی دارِ فنا میں اک سفر ہے متصل
سادگی دیکھو کہ اس دنیا کو گھر سمجھا ہے دل

ہے مکانِ عارضی پر اعتبارِ مستقل
زندگی دھوکھا ہے، فانی ہے طلسمِ آب و گل

شاہِ ذوالقرنین کی سعیِ بقا ناکام ہے
بلکہ عمرِ جاودانِ خضر، مرگ انجام ہے

بالیقیں معدوم ہونے کو ہے جو موجود ہے
درحقیقت زندگی کا موت ہی مقصود ہے

غیرفانی صرف ذاتِ حضرتِ معبود ہے
ورنہ مٹنا قسمتِ ہر شاہد و مشہود ہے

یاد رکھ اے سادہ دل مسحور و مفتونِ حیات
ایک افسانہ فنا کا ہے یہ افسونِ حیات

صورتِ خورشید گو دنیا میں روشن ہے یہ بات
موت کے پنجے سے پا سکتا نہیں کوئی نجات

پھر بھی ماتم خیز ہے ایک ایسے کامل کی وفات
جس کی ہستی ہو کسی فن کے لئے آبِ حیات

حیف صد حیف اے لسان القوم مولانا صفی
زندگی تھی آپ کی شعر و ادب کی زندگی

کس سے شرحِ روئدادِ شاعری اب ہم کریں
کس کو رازِ ہمیتِ شعر کا محرم کریں
آپ ہی فرمائیں مولانا کہ کس کا غم کریں

روئیں فن کے حال پر، یا آپ کا ماتم کریں
آپ کے دامن سے تھا وابستہ نازِ شاعری
آپ کی چپ سے ہے بے آواز سازِ شاعری

۷۷۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

پردہ ڈالا ہے بے نیازی کا رخ چھپانا تھا چارہ سازی کا
ہجر ہے اور اب ہے کیا کہنا اے شبِ غم تری درازی کا
پا گیا اُن کے نقشِ پا سے مراد آرزومند سرفرازی کا
سایۂ تیغ میں ہو سر بسجود حوصلہ ہے کسی نمازی کا
بے صدا کس کے در پہ تیرا گدا پاس ہے شانِ امتیازی کا
خونِ دل ہے دوامِ رنگینی غم ہے موجد چمن طرازی کا
نوحۂ ترکِ صحبت آنی
نغمہ ہے لافِ پاک بازی کا

۷۸۔ غزل

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

ایک آنسو دیدۂ ہر لحظہ گریاں میں نہیں
ہو کہاں سے خون ہی جب قلبِ سوزاں میں نہیں

باغ ہے زاغ و زغن ہیں شورِ بے ہنگام ہے
میں بجرمِ زمزمہ سنجی گلستاں میں نہیں

ہاں نگارِ شعلہ خو سے بھی وفا ہی کر، مگر
خیر پروانے کی طوفِ شمعِ سوزاں میں نہیں

سچ ہے ترتیبِ نتائج کارِ قدرت ہے مگر
سعی بھی کیا آدمی کی حدِّ امکاں میں نہیں

زندگی تا موت فصلِ یک نفس تو ہے مگر
کون سی مشکل ہے جو اِس راہِ آساں میں نہیں

ذرّے ذرّے کی شہادت سے نہ سمجھا تو اگر
پھر تو سمجھانا خدا کا میرے امکان میں نہیں

کیا بتاؤں آسرا کس کی شفابخشی کا ہے
بس یہی سمجھو کہ ثانی فکرِ درماں میں نہیں

۷۹۔ غزل

اپریل ۱۹۵۱ء

ہر غم کو یوں تو ضبط کئے جا رہا ہوں میں
اس غم کو کیا کروں کہ جئے جا رہا ہوں میں

لو ساتھ دے چکی شبِ ہجراں کا زندگی
اب شامِ غم کو ساتھ لئے جا رہا ہوں میں

ہاں آنکھ تر نہیں، مگر آنسو کہاں سے آئیں
ہمراز، خونِ دل تو پئے جا رہا ہوں میں

کیسا سکوں کہ دل بھی تو ہے دفن میرے ساتھ
یہ سازِ اضطراب لئے جا رہا ہوں میں

بھر بھر کے دے رہا ہے فلک تلخ جامِ غم
کیا ذوق ہے بلا کا پئے جا رہا ہوں میں

ہاں پائے صبر تھک گئے لیکن ادھر تو دیکھ
اب سجدہ ہائے شکر کئے جا رہا ہوں میں
آسیؔ بہ سوزنِ نفس و رشتۂ وفا
لب ہائے شکوہ سنج سیئے جا رہا ہوں میں

۸۰۔ غزل

مئی ۱۹۵۱ء

غم کدوں میں کیوں مئے خونِ جگر کا دور ہے
کیا جم و کیخسرو و دارا کا ساقی اور ہے

ایک ہی بات ان سے کہنی تھی مگر کیسے کہوں
باریابی کی اجازت بھی تو زیرِ غور ہے

یوں تو مجھ سے بے تکلف ہیں وہ لیکن بزم میں
اجنبیت کا عجب انداز انوکھا طور ہے

حشر ہے روزِ جزا لیکن یہ دیکھا ہے بہت
کبر کی پاداش دنیا میں ہے اور فی الفور ہے

انقلاباتِ جہاں کا آسماں سے کیا گلہ
کارفرما کے اشاروں پہ فلک کا دور ہے
یوں اُمیدوں کے سہارے کٹ رہی ہے زندگی
ہے خبر منزل بہ منزل، ایک منزل اور ہے
کون سمجھے مصلحت کو ورنہ مانیؔ ظاہرا
بے وفائی پر عنایت کے وفا پر جور ہے

۸۱۔ غزل

جون ۱۹۵۱ء

رہے اپنی وضع پر ہم، یہ تھا حوصلہ ہمارا
نہ بہا ہوا کے رخ پر کبھی عزمِ دل کا دھارا
یہ نصیبِ دل نہیں تھا کہ ملے اُسے کنارا
ترا شکر تو لے ساحل، مری روح کو پکارا
یہ تھکن، یہ بے نوائی، یہ تلاطم اور یہ دھارا
کہیں دور پر اگر ہے تو ہوا کرے کنارا

ترے روزِ دست و بازو سے ہوا تھا کون منکر
کہ سزا کے سلسلے میں ہوا امتحاں ہمارا

یہ بجا کہ ہے تصور تری جلوہ گاہ، لیکن
کبھی بام پر بھی آجا کہ ہو دو بدو نظارا

ارے سامنے ہے ساحل، وہیں کاش ڈوبتا میں
نہ جہاں نگاہ میں تھا کہیں دور تک کنارا

جو سیاہ کار ہیں ہم تو فرشتو اب تم آؤ
کہ ہماری طرح دنیا میں ہوا امتحاں تمہارا

یہ ندا خفی سی کیسی مرے گوشِ دل میں آئی
وہ نگاہ آپ نے کی کہ گماں یہ ہے پکارا

کسے ڈھونڈتے ہو آخر، تمہیں جان کیوں ہے دوبھر
کہ سکونِ دل تو ماہی ہے اجل کا استعارا

غزل ۸۲

جولائی ۱۹۵۱ء

ہجومِ یاس میں تحریکِ مدعا نہ سہی

یہ غم بھی دل کے بہلنے کا آسرا نہ سہی
پرستش اپنی ہی کر اپنی معرفت کے بعد
ابھی یقین میں تیرے نہیں خدا نہ سہی
ترے سوا ہو کوئی اور چارہ ساز، یہ کیا
نہیں اگر مری تقدیر میں شفا نہ سہی
یہ ٹوٹنا ہے خود اپنی جگہ پہ عبرت ناک
وہ میرا دم سہی سررشتۂ وفا نہ سہی
مدد کو شورشِ طوفاں میں کون آئے گا
خدا تو ساتھ ہے کشتی میں ناخدا نہ سہی
ہلاکِ دوریِ منزل، بڑھا، قدم تو بڑھا
کہ ابتدا تو ہے قابو میں، انتہا نہ سہی
ابھی تو حشر کا باقی ہے آسرا آثمی
یہاں نہیں ہے غم و درد کی جزا نہ سہی

۸۳۔ غزل

ستمبر ۱۹۵۱ء

غیر سے زیست کا اے کاش ہو انجام ابھی
وقت اچھا ہے، زباں پہ ہے ترا نام ابھی

ہاں لبالب تو ہے لبریز نہیں جام ابھی
ضبط میں ہے اثرِ گردشِ ایام ابھی

وہ نہیں ہیں تو نگاہوں میں ہے دنیا اندھیر
کیسے روشن تھے منور تھے در و بام ابھی

یہی سمجھیں گے محبت کو حیاتِ جاوید
جو سمجھتے ہیں اسے موت کا پیغام ابھی

بے نیازیِ تمنا کہ ہے اک جنتِ عشق
دل نے پایا نہیں فطرت سے یہ انعام ابھی

تا بہ معراجِ یقیں دیکھئے کب تک پہنچوں
دل کی گہرائیوں میں ہیں بہت اوہام ابھی

عازمِ بارگہہ دوست تھا مانیؔ لیکن
کیا پہنچتا کہ ہے سر بروِ اصنام ابھی

۸۴ - غزل

فروری سنہ ۱۹۵۲ء

قبولِ سجدہ کی یا رب نہ مجھے کچھ تو خبر ہوتی
جبینِ شوق ہی اے کاش جذب سنگِ در ہوتی

مآلِ رہروی سے بے خبر ہوں راہِ ہستی میں
الٰہی خیر سے یہ منزلِ ابہام سر ہوتی

نہ برق و آشیاں کی لاگ سے دل مضطرب ہوتا
اگر دل کی تڑپ قاتل کی شوخیِ نظر ہوتی

غمِ دنیا سے فرصت کی کوئی صورت نہیں یا رب
وہ دردِ عشق ہی کی شکل میں ہوتی مگر ہوتی

بڑی آسانیاں ہوتیں رہِ دشوارِ الفت میں
اگر دیوانگی اہلِ خرد کی راہبر ہوتی

دمِ مرگ اک نفس تھا حاصلِ افسانۂ ہستی
اب اس سے بھی زیادہ کیا کہانی مختصر ہوتی
یہ معذوری ہے اے آنی کہ ہے ناآشنا واعظ
اُسے کیا خاک قدرِ لذتِ دردِ جگر ہوتی

۸۵۔ غزل

مارچ ۱۹۵۲ء

جان پہچان بھی گویا نہیں اُلفت کیسی
اب اُمیدِ نگہِ لطف و مروت کیسی
سختیِ منزلِ اُلفت کی شکایت کیسی
امتحاں کا جو یقیں ہو تو مصیبت کیسی
جب ازل ہی سے کوئی اور ہے دل کا مالک
پھر جو دل چاہے وہ ہو جائے یہ حسرت کیسی
قید میں فرقِ مراتب کی ہیں وہ ہم ہوں کہ تم
ہائے مجبور ہے آزادیِ فطرت کیسی

چیخ اُٹھتا ہے تڑپ جاتا ہے بے بس مظلوم
اور چپ محو تماشا ہے مشیت کیسی
حسن کو حاجت تصدیق تھی سو عشق نے کی
عشق کو پھر بھی رہی حسن سے حاجت کیسی
نہ سہی غم کی جزا غم پہ تبسم کیوں ہے
کچھ بتاؤ تو یہ تعزیر محبت کیسی
تم بھی اُس در کے گدا ہم بھی اُسی در کے فقیر
اے امیرو یہ غریبوں سے رعونت کیسی
وقت آتا ہے گزرنے کے لئے اے مانی
عیش کا ذکر ہے کیا غم کی شکایت کیسی

۸۶۔ غزل

اپریل ۱۹۵۲ء

فتنے افسانے سناتے ہیں، کہیں تم تو نہیں
جانِ عالم یہ تمہارا ہی تکلم تو نہیں

تکلم یہ بزم میں نے صاحبِ محفل کیسا
نگراں پردے ہی پردے ہیں کہیں تم تو نہیں

یہ معما کہ سما جاتی ہے نقطے میں کتاب
اس کا حل مردمکِ دیدۂ مردم تو نہیں

دل کو تسکین سی کچھ گریۂ پیہم سے ہوئی
میرا احساسِ گنہ تیرا ترحم تو نہیں

ڈوبتا دل کا ابھی سے نظر آتا ہے مجھے
بحرِ غم میں ابھی حالانکہ تلاطم تو نہیں

جلوہ گر بھی وہ اگر ہوں تو کہاں تابِ نظر
طالبِ دید ترے ہوش کہیں گم تو نہیں

نغمۂ ناز برسنے لگا اُن آنکھوں سے
یہ مرے سازِ تمنا کا ترنم تو نہیں

ظاہرا سوئے نصیبوں نے جگایا دل کو
واقعاً باعثِ بیداریِ دل تم تو نہیں

اور بھی کچھ ابھی فرمایئے گو اے آنی
بعد محشر کے کوئی جائے تکلم تو نہیں

حدِ امکانِ تماشا پہ نظر گم تو نہیں
صنعِ قدرت یہی مہر و مہ و انجم تو نہیں

تلخیِ زیست گوارا نہ سہی ہم کو مگر
مصلحت جس کی بنا ہو وہ تظلم تو نہیں

ابھی تھم جائے گی بارش ابھی چھنٹ جائے گا ابر
یہ مری آنکھوں سے اشکوں کا تراکم تو نہیں

اپنی ہستی کو جو موہوم سمجھتا ہوں میں
یہ یقیں ہے تری ہستی کا تو ہم تو نہیں

حسنِ گل نغمۂ بلبل طرب آگینیِ مل
میرے کس کام کے ہیں جانِ جہاں تم تو نہیں

خاک اس شبہے میں چھانی ہے بیابانوں کی
میری منزل انہی ذروں میں کہیں گم تو نہیں

موت اک مژدۂ جاں بخش بنی جاتی ہے
کون دامن کی ہوا دینے لگا تم تو نہیں

مسکراتا ہوں مصیبت میں کوئی کیا سمجھے

یہ بھی اک شکل ہے ماتم کی تبسم تو نہیں
ظرف آنی میں ہے وسعت بہ عطائے ازلی
یہ نہ چھلکے گا صراحی تو نہیں خم تو نہیں

(۱) قطعہ تاریخ

وفات حسرت آیات سلطان المتکلمین علامۂ عصر شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

(فارسی)

دارِ دنیا نیست اے آنی بجز دارِ محن
کیست کو از خنجرِ غم دل نمی دارد دو نیم
زیست ملزوم بلا باشد بقدرِ مرتبت

از حسینِ آید، وہند شش تحفۂ ذبح عظیم
سید سبط حسن کو بُد زخاصانِ حسین
یافت انعامِ بلا از درگہہِ ربِ کریم
جان بحق تسلیم کرد آخر کہ در ہر منزلے
جز رضائے حق نباشد مقصدِ طبعِ سلیم
بود بست و ہشتمِ ماہِ محرم وقتِ صبح
کز جہاں بارِ سفر بست و بجنت شد مقیم
آہ آں سبطِ حسن آں عالمِ دینِ متیں
ماہِ سبطِ نبیؐ داعئ راہِ مستقیم
نکتہ دان و نکتہ پرور، نکتہ سنج و نکتہ رس
علم و عقلش در جہاں سرچشمۂ فیضِ عمیم
از کمالاتش چہ می پرسی، لبِ او وانمود
غنچہ ہائے رازِ حکمت را چو در گلشن نسیم
پایہ اش حسنِ قبول و مایہ اش حسنِ کلام
بود از ذات و صفاتش طورِ میر اکلیم

رغبتِ رحلت چوں بیست آں راہیِ ملکِ بقا
قلبِ او شد بار دانش راجیِ لطفِ رحیم
من ز منزل ہائے او پرسیدم و رضوان خلد
گفت۔ در روحٌ و ریحانٌ و جنات النعیم

۱۳۵۴ ہجری

(۲) ایضاً

اے فلک عام ہے یوں تو ترا انعامِ ستم
اہلِ دل کے لئے مخصوص ہے سوغاتِ الم
ہر نفس اِن کا ہے اک سلسلۂ غم کی کڑی
منزلِ درد میں پڑتا ہے جو اٹھتا ہے قدم
شکرِ الطاف کو وا ہے دہنِ زخمِ جگر
اس جراحت کے لئے ننگ ہے فکرِ مرہم
شدتِ درد ہے لیکن بہ تقاضائے وفا
نہ زبانِ گلہ آلود نہ چشمِ پر نم

یوں نہ پوچھو محملِ شکوہ و فریاد ان سے
سر پہ جب کوہ ملا ہو تو سنو شکرِ کرم
رکھتے ہیں پیشِ نظر سبطِ پیمبر کی مثال
یعنی نقش ان کی جبیں پہ ہیں وہی نقش قدم
مثلِ سبطِ حسن اکثر بہ تاسیٔ حسین
امتحاں گاہ سے گزر رہے ہیں یہ اربابِ ہمم
ابھی بھولی تو نہیں سبطِ حسن کو دنیا
ہاں ابھی تازہ ہے اس عالمِ دیں کا ماتم
بست و ہشتم کو محرم کی ہوئے ہیں کے دن
مدتوں محو نہ ہو دل سے یہ ہے ایسا غم
آہ ۔ صدیوں نہیں کرتا ہے زمانہ پیدا
ایسے اربابِ کمال ان کے کمالوں کی قسم
ادب اُن کا اُدبا کے لئے خود حدِ ادب
افصح العصر خطیبوں میں خطیبِ اعظم
حسنِ تقریر کہ پہنچے جو درِ جنت پر

باتیں ہونے لگیں رضواں ہیں اور ان میں باہم
شوقِ رضواں ابھی باقی تھا کہ آواز آئی
ہو بھی اب سبطِ حسن داخلِ گلزارِ ارم

۱۳۵۴ ہجری

(۳۲) ایضاً

رحلت حضرت والد ماجد جناب مستطاب مولانا سید کلب جعفر صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

(فارسی)

خواہم امروز خطاب از تو کنم اے پدرم
باش چنداں کہ وضو سازم و نامت ببرم
ذاتِ پاکِ تو سزاوارِ غلامی علیؑ
نفسِ قدسیِ تو انفاسِ ملک را ہمدم
چیست آقائے من اے سید کلب جعفر

کہ بسویم تو نمی بینی و من می نگرم

تو کہ درد ہر بدی ربِّ مجازی ما را

بود یک ذاتِ تو صد مخزنِ اشفاق و کرم

اے کہ ما را بہ دو صد ناز و نعم پروردی

آہ امروز نگر خاک نہ بینی بہ سرم

سحرِ چاردہ از ماہِ جمادی الثانی

آمد و صبر بر دازدلم و دل زبرم

چہ بگویم بفراقِ تو چساں می گزرد

کہ بود غم کدہ ہر ذرّۂ دیوار و درم

طائرِ روح تو و سیرِ خیابانِ بہشت

قفسِ خاک من و آرزوے بال و پرم

من بفکرِ سن و چشمِ دلِ من می بیند

کہ بفردوسِ جناں ہست مقامِ پدرم

۱۳۵۴ ہجری

(۴) ایضاً

تاریخ تاج پوشی اعلیٰحضرت سرکار راجہ محمد امیر احمد خاں صاحب بالقابہٗ والئی ریاست محمود آباد

(فارسی)

برتخت قدم نہاد امیر ذی شاں

راعی بعدالت و رعایا بہ اماں

ثانی بخروش از پئے سال جلوس

تاج و سرکار من امیر احمد خاں

۱۹۳۶ء

(۵) - دیگر

چو شد زیب سر سلطنت راجہ امیر احمد

شدہ سعد زبان من ہمیں مصرع ثانی

مبارک [illegible] تاج [illegible]

امیرِ عصر مامانی برادرِ ننگِ جہان بانی

۱۳۵۴ ہجری

(۶) قطعہ تاریخ

ارتحال پر ملال برادر عزیز مولوی سید حیدر مہدی صاحب ایڈووکیٹ الہ آباد مغفور

کب آہ کسی سے کی زمانے نے وفا
کب شکوۂ جورِ آسمانی نہ رہے
حیدر مہدی کو اور جینا تھا مگر
تا عہدِ کمالِ کامرانی نہ رہے
اے چرخ ترا تو کچھ نہ بگڑا لیکن
ہم کو وہ لطفِ زندگانی نہ رہے
سن آنی سوگوار سے نوحۂ غم
[illegible]

(۷) قطعہ تاریخ

(فارسی)

وفاتِ حسرت آیات محقق جلِ عالم بے بدل حضرتِ سرکار ناصر الملۃ آقائی آقا سید ناصر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

ناصرِ دیں سیدِ ناصر حسین مجتہد قصرِ شریعت را عماد

در جہانِ ظلم پرور عادلے مصلحے در عالم کون و فساد

چوں خوشش آمد بہار باغ خلد رفت و وادا ایں گلشن دنیا بباد

خود بہ آغوشِ سرور جاوداں وز پئے ما طرح ماتم در نہاد

نوحہ زن ثاقب پئے سالِ وفات حیف کا بن رکن ہدایت اوفتاد

۱۳۶۱ ہجری

(۸) قطعہ تاریخ

مفارقتِ دوام از فرزند دلبند جواں مرگ آنسید آفتاب احمد وکیل مرحوم

دم خفا سینے میں دل پر اضطراب
یارب اس غم کا بھی ہے کوئی حساب
پھنک رہا ہے سوزِ پنہاں سے جگر
سر میں چکر سا ہے آنکھیں ہیں پر آب
آفتاب احمد مرے نورِ نظر
دیکھ میری روحِ مضطر کا عذاب
باپ ہوں میں وہ برا ہوں یا بھلا
خیر ہے جتنا ہے مجھ کو پیچ و تاب
لیکن اے میرے جوانا مرگ دیکھ
کب عباس اپنے غم کا اضطراب

حق بجانب ہے انھیں جو رنج ہو
سب بجا ہے ان کے دل کا التہاب
تربیت دی تجھ کو بیٹوں کی طرح
یوں دکھائی تجھ کو ہر راہِ صواب
تو مٹا اور ان کی محنت مٹ گئی
آہ دنیا تیرہ ہے بے آفتاب
ہائے یہ میرے مقدر کا لکھا
میں لکھوں تاریخ با چشم پر آب
میرے بچے باپ سے اک شعر سن
تا قیامت ہے ابھی تو وقت خواب
دیکھ ماتی ہے سرِ بالین قبر
سن مسیحی اور ہجری میں خطاب
ہائے یہ خواب اے ظہورِ انقلاب
۱۹۴۶ء خاک میں پنہاں ہے گویا آفتاب
۱۳۶۵ ہجری

(۹) ایضاً (فارسی)

سینہ ام یاراں بغم مانند چاک
بہرِ شرحِ داستانِ دردناک
در درونِ سینہ زخم بنگرید
ہم دلم بینید کز غم شد ہلاک
آہ چوں لختے ز دل گردد جدا
از نماند دل بحالِ خود چہ باک
پارۂ قلب آفتاب احمد وکیل
مادحت پاشاہِ دیں روحی فداک
خوش بیان خوش لہجہ خوش خو خوش صفات
خوش عمل خوش خلق و صالح نیک و پاک
مثل او نایاب در حسنِ عمل
ہم بدیں و ہم بدنیا انہماک
گشت جنت منزل آں آفتاب
تا بجا نورے رسد از خلدِ پاک

کلب عباسم کہ باشد عمِ او
داشت با او مثلِ فرزنداں تپاک

تربیت داد و مثیل خود نمود
از من افزوں ترولش گردید چاک

وائے ما و فکرِ تاریخ وفات
جان می گردد زنیشِ غم ہلاک

ہم بہ ہجری ہم بسالِ عیسوی
ہست از ثانی فغانِ درد ناک

زانقلابے آہ روزم تار شد
۱۳۶۵ھ
آفتابے شد نہاں در زیرِ خاک

(۱۰) قطعہ تاریخ ۱۹۴۶ء

ارتحال پرملال محبِ محترم و شفیقِ معظم جناب سید علی اکبر صاحب جائسی غفرہ اللہ

کہ جمعہ ۲۱ ربیع الاول بود

اجل رہے بہ جنابِ علی اکبر یافت
چہ گویم آہ کہ با وصفِ گردشِ شب روز
مثیل او بہ جہاں آسمان کم تر یافت
کجاست اے وطنم جوہری قدر شناس
کہ می نہاد بسر ہر کجا کہ جوہر یافت
عجب ہمیں کہ بہ ہنگامہ زارِ دارِ فنا
بجست راہِ بقاؤ درجناں دریافت
چو رفت تشنہ بیادِ شہید کرب و بلا
زدستِ ساقیٔ کوثر شرابِ اطہر یافت

شد او بنامِ علی تر زبان و من گویم
بوقتِ نزع رواں اجرِ عشق حیدر یافت
ندا بسامعِ محزوں رسید از پئے سال
جوارِ اکبرِ عالی۔ علی اکبر یافت

۱۳۶۸ ہجری

(۱۱) قطعہ تاریخ

وفاتِ حسرت آیات نابغ المطلع المعظم شمس العلماء آقای آقا سید ابن حسن صاحب قبلہ مجتہد طاب ثراہ

مطاع معظم اخ المحترم — بسیرت جمیل و بصورت حسیں
ملائک شمیم سید ابنِ حسن — وہ سرمایۂ نازِ اہلِ یقیں
وہ زینت دہِ مسندِ اجتہاد — وہ رونق دہِ بزمِ شرعِ متیں
روانہ ہوئے سوئے ملکِ بقا — کہ منظور تھی سیرِ خلدِ بریں
خوشی اُن کو گلگشت جنت کی ہے — یہاں سربزانوئے غم مومنیں
خزانہ ہے گم علم و حکمت کا آج — کہاں سے کریں کسبِ فیض اہلِ دیں
تردد میں تاریخِ رحلت کے تھا — ابھی مانی سوگوار و حزیں
کہ آئی سرِ قبر آوازِ غیب — تہِ خاک گنجینۂ علمِ دیں

۱۳۶۸ ہجری

(۱۲) قطعہ تاریخ

وفاتِ حسرت آیات جناب سید امجد علی صاحب لکھنوی مغفور

کیا بیاں ہو شانِ سردارانِ شبانِ بہشت
نام سے جن کے جہاں میں اعتبارِ خلد ہے

یہ تو یہ ہیں خادموں کا ان کے ہے یہ مرتبہ
منتظر جن کے قدم کی خود بہارِ خلد ہے

جلوہ گر ہوتے ہیں جا کر دوستدارانِ علی
ان سے جنّت کو شرف ان سے وقارِ خلد ہے

سیدِ امجد علی ان کا محب ان کا غلام
عالمِ فانی سے رہ پیمائے دارِ خلد ہے

تیسری جولائی سن اُنیس سو انچاس کی
آ گئی اور زیرِ پا اب رہگزارِ خلد ہے

غلغلہ ہے آمد آمد کا جناں میں ہر طرف

نعرہ ہائے شادمانی اور جوارِ خلد ہے

صرفِ ماتم ہیں یہاں اُن کے محبِّ اقربا

اور معمورِ مسرت فرح زارِ خلد ہے

سالِ رحلت کے لئے ہاتف نے آتی سے کہا

سیدِ امجد علی ہیں اور دیارِ خلد ہے

۱۳۶۸ ہجری

(۱۳) قطعہ تاریخ

برادرِ مکرم جناب سید انور حسین صاحب جائسی غفرہ اللہ

وہ کون اہلِ خرد ہے جسے یہ علم نہیں

حیاتِ دہر فقط وہم ہے، اجل ہے یقیں

ہے کل کی بات کہ انور حسین دنیا میں

تھے زیبِ محفلِ احباب، ہم سبھوں سے قریں

اب آج گلشنِ جنّت مقام ہے ان کا

ہم اُن سے دور ہیں اُن کے الم میں سوگ نشیں

یہ اپنے رنگ کے ایک آدمی تھے جائس میں

اب اس دیار میں ان کا کوئی نظیر نہیں
تعلقات میں مخلص معاملات میں صاف
بڑے امین صداقت شعار صاحبِ دین
تھا اس نواح کے انساب پر عبور انھیں
یہ جانتے تھے کہ ہے کس میں نقص کس میں نہیں
فراق ان کا غمِ جاں گداز ہے لیکن
عیاں ہے یہ کہ بجز صبر کوئی چارہ نہیں
ہوئی جو غم زدہ ثانی کو فکرِ سالِ وفات
کہ کچھ نہیں تو یہی ہو ذریعۂ تسکین
سروشِ غیب کی آواز یک بیک آئی
کہ۔ جائے سید انور حسین خلد بریں
۱۳۶۹ ہجری

(۱۴) قطعہ تاریخ

رحلتِ پرحسرت خال المعظم جناب سید باقر علی صاحب قبلہ نقوی الجائسی مرحوم و مغفور

ماہِ عزا کی سترہویں شبِ غضب کی رات تھی

جب روح ماموں جان کی راہی سوئے جنت ہوئی

راحت سے ہیں وہ خلد میں کہرام ہے گھر میں بپا

ہم سوگواروں کے لئے یاد اُن کی ماتم بن گئی

لے دے کے باقی تھے یہی اب اک بزرگِ خاندان

صد حیف یہ بھی چل بسے افسوس اے بدقسمتی

یوں تو تمام اوصافِ انسانی تھے ان میں مجتمع

خلق و تواضع میں مگر مشہور تھی ذات آپ کی

کیسے محبِ اہل بیت و مومنِ پاکیزہ نفس

کیسے عزادارِ حسین و عاشقِ آلِ نبی

مجلس جو کرتے تھے بپا، در پر کھڑے رہتے تھے یہ

ہوتی تھی دربان کی طرح بزمِ عزا میں حاضری

فکرِ سنِ رحلت میں تھا مانیؔ کہ آئی یہ صدا

ہیں اب جوارِ پنجتن میں سید باقر علی

سنہ ۱۳ [illegible] ہجری